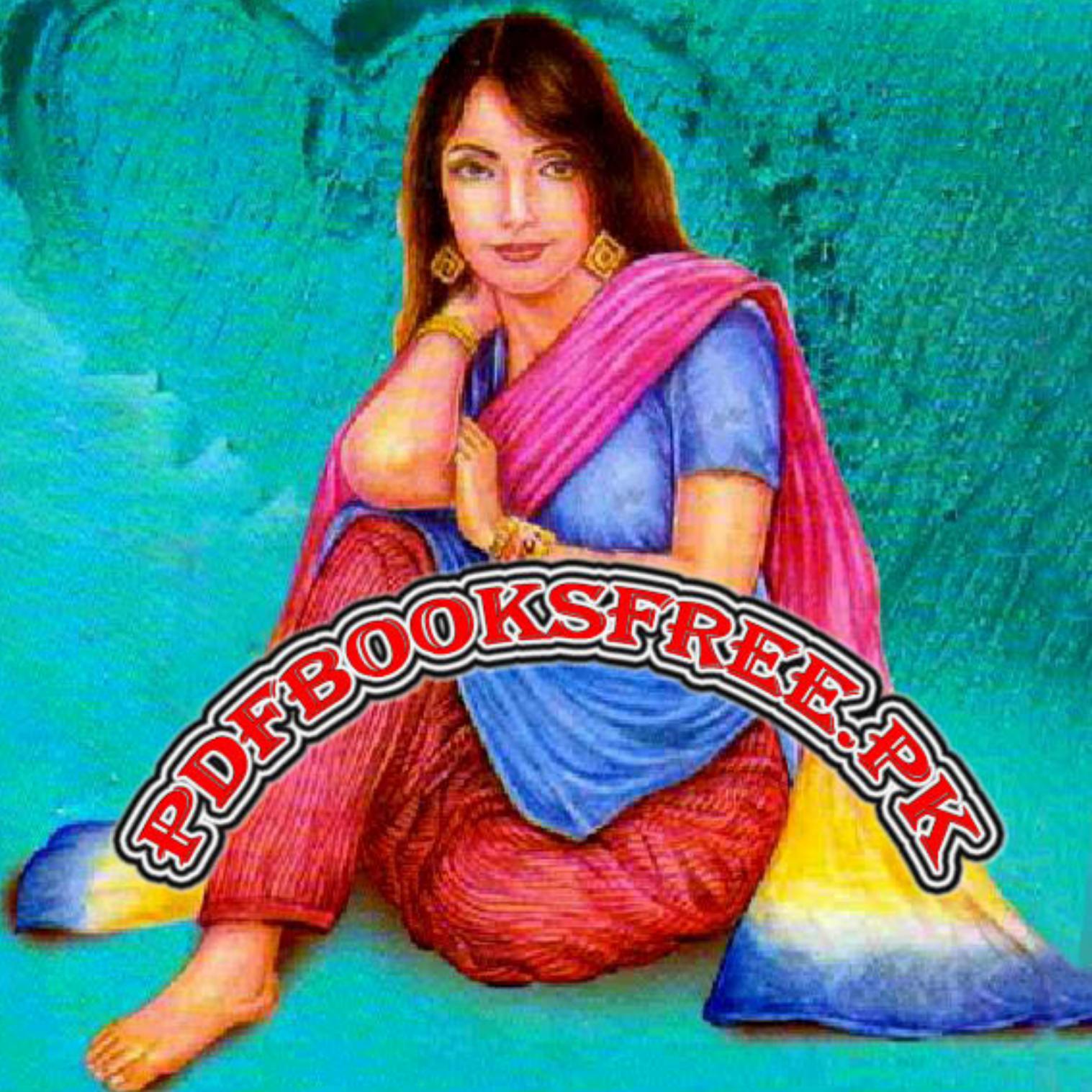


# کہنچھ سے محبت



عابدۃ نوجس

تھا بیٹھی ہوئی سروش پوری سنجیدگی سے سوچ رہی تھی کہ اسے کیا ہوا ہے۔ وہ تو اچھی بجلی بننے کیلئے والی لڑکی تھی۔ لیکن یکا یک وہ اتنی سنجیدگی سے کیا سوچنے لگی تھی۔ اسے اپنا آپ بڑا عجیب انجینی سامسوں ہو رہا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ وہ نہیں رہی۔ جیسے اس کے اندر ایک اور سروش اگھڑائی لے کر بیدار ہو گئی ہے۔ اسکی سروش جسے اس نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔ جسے وہ اس طرح دیکھ رہی تھی۔ جیسے پہلی بار کسی کو دیکھا جاتا ہے۔ جس پر نظر ڈالتے ہوئے وہ جھجک رہی تھی۔ جس کے اندر جھانکتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ جس سے نگاہ خانے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔ جسے وہ بڑی حیرت اور استعجاب سے تک رہی تھی۔

کچھ ڈری ہوئی سی، کچھ سہمی سہمی، کچھ جھجکتی، لپاتی ہوئی سی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا یہ روپ کوئی دیکھ نہ لے، اس کی یہ انجینی سوچیں کوئی پڑھ نہ لے، تصورات کے یہ نرالے رنگ کہیں جھلکا نہ انھیں۔

وہ تو ابھی خود بھی ان سے پوری طرح آشنا نہیں تھی۔ ان سوچوں کو اس نے پرکھا نہیں تھا۔ ان رنگوں کو اس نے پہچانا نہیں تھا۔ لیکن اک انوکھی مسرت نے اسے سرشار کر دیا تھا۔ جو کہیں اندر سے ہی پھوٹ رہی تھی۔ اور اس کی پھوار میں وہ شرابوری ہوئی تھی۔ اسے اپنے چہرے کے گرد روشنی کے اک ہالے کا سا احساس ہوتا تھا۔ آئینہ دیکھے بنا ہی اسے اپنی کشش اور دلکشی کا یقین سا ہو گیا تھا۔

سے، بڑے اشتیاق سے اس کی یہ خوبصورت چھیڑ چھاڑ دیکھ رہی تھی۔ اس سے محظوظ ہو رہی تھی۔

وہ اس لمحے کو بڑی پریت، بڑی محبت سے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی۔ زندگی بھر اپنے ساتھ بے حد عزیزشے کی طرح ہمیشہ اپنے قریب اپنی ٹانگیں میں، اپنی دوش میں، اپنے دل میں کہ سب سے چھپ کر جب چاہے اسے دیکھ لے، جب چاہے اسے ننگے کی طرح ٹٹکٹالے، جب چاہے اسے چھو لے۔

یہ پیارا لمحہ کس طرح اچانک اس کی زندگی میں آن جا تھا۔ اتنا روشن اور حسین لمحہ کہ اس نے آنے والے سارے لمحوں کو جاہل دیا تھا۔ وہ اس کے بارے میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہی تھی کہ یہ کنول ایک ایسا کھلا ہوا لمحہ کس طرح کھڑ کر رہتی ہوئی زندگی کی سطح پر ابھرا آیا تھا۔



حاضر اب وہ حاضر نہیں رہا تھا۔ جو بالکل اک عام سا لڑکا تھا۔ ان کا دور کا رشتہ دار بھی تھا۔ اور ہاسٹل میں کمرہ خالی نہ ہونے کے سبب ان کے یہاں ہی رہائش پذیر تھا۔ جس کے آنے پر اس نے بڑی ناک بھون چڑھا کر بگٹو کو اپنے کمرے میں جگہ دی تھی۔ تاکہ ریلوے کے کمرے میں اس کیلئے گنجائش نکل آئے۔

وہ اس کی آ رہے، اس کی موجودگی سے قطعاً متاثر نہیں ہوئی تھی۔ اسے ایک معمولی واقعہ سمجھ کر نظر انداز کر گئی تھی۔ وہ اس سے اکثر بات کر لیتی تھی۔ کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ بے تکلفی سے مانگ لیتا۔ شام کو ان کے ساتھ بیٹھ کر ٹی وی دیکھتا، کبھی باورچی خانے میں آ کر وہیں بیٹھ کر کھانا کھانے لگتا۔ پسند کی چیز نہ پکی ہوتی تو خوب شور مچاتا۔

اسے اپنی طرف اٹھتی ہوئی ہر نگاہ میں سٹائش اور پسندیدگی کی جھلک نظر آتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دنیا کی حسین ترین لڑکی ہے۔ اس کے اندر اک عجیب جذبہ اعتماد اور تقاضا پیدا ہو گیا تھا۔ وہ یوں سب سے بے نیاز ہو گئی تھی جیسے کسی کی پر دانہ ہو، جیسے کسی کی ضرورت نہ ہو۔

خود کو دیکھنے، خود میں جھانکنے اور خود کو محسوس کرنے میں بڑی لذت تھی۔ اپنا ہی مشاہدہ کرنے میں کتنا مزہ تھا۔ اپنے ہی قریب آ جانے کا لطف سوا تھا۔ وہ اپنی ہی دوست بن گئی تھی۔ اپنی مداح، اپنی پرستار۔

یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ وہ حیرت مانی ہو گئی تھی۔ لیکن اس حیرت میں جو انبساط آمیز سرشاری اور شادمانی تھی۔ وہ اس کیفیت میں ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ اک انوکھی اور نرانی کیفیت، جس نے اسے بالکل ہی بدل دیا تھا۔ اسے کوئی اور ہی لڑکی بنا دیا تھا۔ بڑی اہم، بڑی نرالی حسین اور پر اعتماد لڑکی۔ جسے اپنی اہمیت، اپنے حسن اور اپنی کشش کا بھرپور احساس تھا۔ جو تروتازہ اور خوبصورت سمجھتے ہوئے گلاب کی طرح سراٹھائے تھی۔ اسے کسی پھول کی مہلک سے، کسی پھول کے رنگ سے کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ اپنے طور پر مکمل ممتاز اور آسودہ تھی۔

اس کے لیوں پر اک نرالی مستکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سہانا خواب تھا۔ اس کے چہرے پر اک نیا رنگ تھا۔ وہ تنہا نہیں تھی۔ خوبصورت اور انجانے تصورات کے اک جھرمٹ نے اسے گھیر رکھا تھا۔ وہ تصورات کی اک پرت اٹھاتی تھی۔ اور اس کے اندر جھانکتی تھی اک اک رنگ کو چھوتی تھی۔ پچھائی تھی۔ وہ رنگوں نغموں اور خوشبوؤں میں کھو گئی تھی۔

وہ ننھا سا سائبر لہرہ بار بار آ کر اسے چھیڑتا تھا۔ اسے چھو چھو لیتا تھا۔ اسے گدگداتا تھا۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ بڑی تمنا سے بڑے ارمان

میں خود ہی دھونو گی۔“

”نہیں۔“ عامر نے تمہیر لہجے میں کہا۔ اس کی آواز میں اتنا زور تھا، اس کا لہجہ اتنا قطعی تھا، اس کا انداز اتنا جارحانہ تھا کہ سروش نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر اس کی گرفت مضبوط تھی۔ پانی کی ٹھنڈی پھیوار سے دونوں کے ہاتھ بھیگ رہے تھے۔

سروش نے اس کی آنکھوں میں ایک نئی دنیا دیکھی۔ ایک نئی اور نرمالی تھی سہاٹی بنی سنوری دنیا۔ اک ایسا جہاں، اک ایسی کائنات جس میں کھو جانے کو دل چل جائے، جس میں بس جانے کی تمنا ہونے لگے، جس کو اپنا لینے کی آرزو زندگی بن جائے۔ اک تروتازہ کیفیت میں سروش کو یقین سا ہو گیا کہ یہ کائنات اس کیلئے ہے۔ اس کی آنکھوں میں جو اک دنیا بسی تھی۔ وہ اسی کیلئے سنوری تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے گلاب کے پودے سے لہکتے ہوئے گلابوں سے لہ گئے ہیں۔ فضا میں خوشبو کے جھالے سے نکھر رہے ہیں اور وہ پھولوں کی شہزادی کی طرح کیوں کا تاج سہانے خوشبو میں لہتی ہے۔

عامر نے کچھ نہیں کہا۔ نہ ہی سروش نے کوئی لفظ بولا۔ بس اس ایک لمحے میں ہی دونوں نے ایک دوسرے کے اندر جھانک لیا۔ ایک دوسرے کو سمجھ لیا۔ ایک دوسرے کو یقین دلایا اور عامر نے اک سہکتا ہوا سرخ گلاب اس کی بھیگی ہوئی دستائی ہتھیلیوں پر رکھ دیا۔ وہ گلاب ابھی تک اس کی منگی میں بھینچا تھا۔

اس کا تصور من میں چٹکیاں لینے لگا تھا۔ اس کی موجودگی نے لمحوں کو بڑا ہی حسین بنا دیا تھا۔ اس کے نام نے تمناؤں میں اک خوشگوار رفاقت کا روپ دھار لیا تھا۔ اس کی اک نگاہ من کو پھول کی طرح کھلا دیتی تھی۔ وہ اس کا نام پکار کر اسے اک مدھر نغمے میں احوال دیتا تھا۔ اس نے زندگی کو اک نرالا مفہوم دے دیا تھا۔ اس نے خود سے پیار کرنا سکھلا دیا تھا۔ اس کے ہونے سے لمحے پھول کی طرح کھل اٹھتے تھے۔ اس کی

مگر وہ اس کیلئے کبھی اتنا اہم نہیں ہوا تھا۔ بس صبر کے اک فرد کی طرح معلوم تھا۔ یا اس کی حیثیت اک خوش اخلاق مہمان کی ہی تھی۔ جس کے جلد یا بدیر رخصت ہو جانے کا یقین ہوتا ہے۔ جس کی توابع کرتا۔ جس کے آرام کا خیال رکھنا معمولات میں شامل ہوتا ہے۔

لیکن آج اچانک گلاب کی نیاریوں کو ٹھیک کرتے ہوئے اس نے قدموں کی آہٹ پر سزا کر دیکھا تو عامر اس کے عقب میں تھا۔ وہ پلٹ کر پھر کام میں مصروف ہوئی۔ اور نیاریاں سنوارنے لگی۔ وہ کچھ دیر اس کے پیچھے کھڑا رہا۔ پھر اس کے قریب ہی اسی کی طرح زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ سروش نے پھر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی چونکا دینے والا مسکوراہٹ نہ دیکھ رہا تھا۔ وہ بظاہر کچھ لائق سا اور خاموش تھا۔ نہ ہانے وہ کیا سوچ رہا تھا۔

سروش نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی۔ اور اپنے کام کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے سفید ملائم ہاتھ منگی سے بھر گئے تھے۔

”دیکھو تم نے اپنے ہاتھ کتنے گندے کر لئے ہیں۔“ عامر نے اچانک کہا۔

”ابھی دھواؤں کی۔“ سروش مسکرائی۔

”نہیں ابھی دھوؤ۔ مجھے اچھے نہیں لگ رہے ہیں۔ تمہارے یہ منگی سے بھرے ہوئے ہاتھ۔“ اس نے عجیب بیٹھے لہجے میں کہا۔ جس میں حکم کی آمیزش تھی۔

سروش بس پڑی۔ ”کہا ہے دھو لو گی ابھی۔“ اس نے بدستور کنگر چلتے ہوئے کہا۔

”نہیں ابھی دھوؤ اسی وقت۔“ عامر نے اس کے ہاتھوں میں سے کنگر گرا دیئے۔ قریب پڑا ہوا پانی کا پائپ اٹھایا اور اس کے ہاتھوں سے منگی چھڑانے گا۔

سروش نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو تا میرے ہاتھ

کیلئے کیا بن گیا ہے۔



انہی دنوں رضی بھی کسی دورے پر جاتے ہوئے ان کے یہاں کچھ روز کیلئے رک گئے۔ وہ بلائے ہی خوش مزاج انسان تھے۔ سب سے خاصے بے تکلف تھے۔ ان کے آجانے سے گھر بھر میں اک گہما گہمی اور رونق کا سماں پیدا ہو جاتا تھا۔ راجہ سے ان کی گاڑی چھنتی تھی۔ دونوں اکٹھے ہو جاتے تو گھر بھر میں اودھم مچا دیتے۔ ابھی جگنو کو تنگ کیا جا رہا ہے، تو ابھی نازش کی شامت آئی ہے اور نہیں تو سروش کی دوستوں کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ ان کے عجیب و غریب نام رکھے جا رہے ہیں۔ دونوں کسی نہ کسی کے لئے آفت بلائے رکھتے تھے۔



خاموشی بولتی تھی۔ اس کا نظم گدا گدا تھا۔ وہ اتنا قریب آ گیا تھا، کہ آنکھیں اس کے سوا کچھ نہیں دیکھتی تھیں۔ وہ دل میں اس حد تک جا گزریں تھا۔ کہ تصور میں اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ روح میں اس طرح اتر گیا تھا۔ کہ اس کے سوا کسی کی آرزو نہیں تھی۔ وہ مسکور ہو گئی تھی۔ وہ کھو گئی تھی۔ وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ کیا یہی محبت ہے؟

لیکن اسے خود کو بتانے خود کو یقین دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا انگ انگ اس کا رواں دواں اس رنگ میں رنگا گیا تھا۔ اسے ہر سمت سے اسی کی صدا آتی تھی۔ اسے ہر طرف وہی نظر آتا تھا۔ اس کے لبوں پر ایک ہی نغمہ تھا۔ جو صرف عامر کیلئے تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اونکھا اتنا نرالا، اتنا قریب اور اس کے اپنے اندر تھا۔ کہ وہ ہر لمحے اک نرالی احساس سے ہلکتا ہونے کو محبت کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

لہجے تتلیاں ہی بن کر اڑ رہے تھے۔ وقت خوشبو کی طرح گرد و پیش پھیلا تھا۔ وہ دونوں اک انوکھے جذبے میں سرشار وقت کی مہربانوں کا لف اٹھا رہے تھے، کہ عامر کو گھر سے بلاوا آ گیا۔

سروش دھک سے رہ گئی۔ اسے سہانا خواب ٹوٹ جانے کا سا احساس ہوا۔ وہ اتنی ہی بات سے پریشان ہو گئی۔ اس کی جدائی کے خیال سے اس کے اندر نوٹ پھوٹ ہونے لگی۔ عامر نے اسے تسلی دی کہ ابھی بہن کی معافی ہونے والی ہے اسی لئے اسے اچانک بلایا گیا ہے۔ لیکن وہ بہت جلد واپس آنے کی کوشش کرے گی۔

سروش نے دل کو تسلی دے لی۔ لیکن اداسی رگ و پے میں اترتی جاتی تھی۔ اس کا تلخ ذائقہ اس کے روئیں روئیں میں بس گیا تھا۔ عامر کیا کیا تھا۔ من کی ساری جولاٹیاں، دل کی خوشیاں اور روح کی سرشاریاں ساتھ لیتا گیا تھا۔ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگتا تھا۔ لمحوں سے جیسے سارے رنگ اڑ گئے تھے۔ گرد و پیش سے جیسے حرکت و حرارت غائب ہو گئی تھی۔ ہر طرف ایک پندرہ کی چھائی تھی۔ وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ عامر اس

”میں صرف تمہاری حد پر اواز، تمہارا رخ اور رفتاری گھنڈہ معلوم کرتا چاہتا ہوں۔“

”پر اواز تو بلندی کی جانب ہی ہوا کرتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اور رخ۔“ انہوں نے پوچھا۔

”رخ اسی وقت متعین ہوگا۔“ سروش نے روانی سے کہا۔

”اچھا یعنی اب مجھے سنجیدگی سے بتاؤ کہ تمہارے سامنے کوئی مقصد بھی ہے یا بس یونہی ڈگری لینے کے شوق میں دھڑا دھڑا جھٹکیں پاس کرتی جاتی ہو۔“

سروش کی آنکھوں میں عامر کے تصور نے ایک چمک سی بھردی۔ اس کے پچھلے ارمان اس کے رخساروں پر نگاہ سے بن کر کھل اٹھے۔ وہ اک لمحے کو آنے والے وقت کے خیالوں میں کھو گئی۔



زندگی اس کیلئے کتنی محبوب تھی۔ اس کے پاس زندگی بسر کرنے کا جواز تھا۔ اس نے حیات کی سب سے بڑی خوشی پائی تھی۔ ایسی مسرت جو ہمیشہ ساتھ رہنے والی تھی۔ جو ساری زندگی پر مچھلتی تھی۔ جو زندگی کا محور اور مرکزی نقطہ تھی۔ اب تو اسے کچھ اور سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اسے کوئی پروگرام نہیں بنانا تھا۔ وہ تو اپنے لئے سارے فیصلے کرنے کا حق کسی اور کو سونپ چکی تھی۔ یہ سب کتنا دلربا، سنسنی نیز اور مطمئن کر دینے والا تھا۔ کہ اس کیلئے کوئی اور سوچے گا۔ اس کی خاطر کوئی اور فیصلے کرے گا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر کوئی اور منزل تک لے جائے گا۔

اس کے حسین تصورات کا عکس اس کے دلنواز چہرے پر بھی پڑ رہا تھا۔ اس کی دلکش آنکھیں گلابی ہو گئی تھیں۔ اس کے رخساروں پر اک انوکھی چمک تھی۔ رضی بھیا

سروش جو عامر کے جانے سے بڑی بیزار اور پڑمردہ سی ہو رہی تھی۔ ان کے اچانک آجانے سے کچھ بہل گئی تھی۔ ان کے ساتھ اس کی بھی طویل نشستیں رہتی تھیں۔ ان کا مطالعہ گہرا تھا۔ دلچسپ گفتگو کرتے تھے۔ اکثر اسے کسی بحث میں الجھا دیتے۔ کہاں کہاں سے دلیلیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے اور اسے زچ کر کے خوب ہی لطف لیتے۔

اکثر ان کا موضوع آزادی نسواں ہوتا۔ رعب انہیں خوب تھے دیتا۔ دوسری طرف سروش اور پائزہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتیں لیکن کوئی فیصلہ نہ ہو پاتا۔ سب ہی اپنے موقف سے ڈٹ جانے اور اک دوسرے کی دلیل کو رد پر رو کرتے۔

اس بار بھی ان کے پسندیدہ موضوعات پر خوب بحث مباحثہ ہوتا رہا تھا۔ مگر اک روز انہوں نے موضوع بدلا اور بڑی سنجیدگی سے اس سے پوچھنے لگے۔ سروش یعنی تمہارا کیا پروگرام ہے؟

”میرا پروگرامہ کونسا پروگرام؟“ سروش نے پوچھا۔

”زندگی کا پروگرام۔“ وہ بڑے اطمینان سے گویا ہوئے۔

”یعنی؟“ اس نے سوالیہ انداز میں ابرو اچکا ئے۔

”یعنی سولہ سترہ جہاں میں پڑھ کر جب تمہیں سرخاب کے پر لگ جائیں گے تو تم کیا کرو گی۔“ انہوں نے اپنے مخصوص گفتگو انداز میں پوچھا۔

سروش کو ہنسی آگئی۔ ”ظاہر ہے پھر تو اڑوں گی۔“

اس نے بڑے لگاؤ سے ان کی طرف دیکھا اور غمخیز ہوئے لہجے میں بولی  
 ”رضی بھیا! میں آپ کا احترام کرتی ہوں۔“  
 وہ ہنسی۔ ”محبت کی بنیاد احترام بھی تو ہوتا ہے سروش۔ لیکن جس انداز میں تم  
 نے کہا وہ کچھ بزرگانہ سی محبت ہوتی ہے اس کو شفقت کہتے ہیں شاید۔“  
 سروش کو وہ اس ہلکے پھلکے انداز میں بات کرتے بہت اچھے لگے۔ وہ کھل کر  
 مسکرائی۔ ”رضی بھیا! میں واقعی آپ کی بہت عزت کرتی ہوں۔“  
 ”لو اور سنو۔“ ارے لڑکی۔ تم مجھے اپنا سر پرست یا بزرگ بنانے پر کیوں تکی  
 ہوئی ہو۔ اب میں تم سے اتنا سینئر بھی نہیں ہوں کہ یہ عمدہ بخشش قبول کر لوں۔“  
 ”تو پھر میں یوں کیوں نہ کہہ دوں کہ آپ میرے اچھے دوست ہیں۔“  
 ”ہاں یہ ہوئی ثابت۔“ وہ خوش دلی سے بولے۔  
 ”او ہا تم۔“ انہوں نے اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلا دیا۔ سروش نے اپنا خوبصورت  
 ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اور پوری سچائی سے بولی رضی بھیا! مجھے آپ پر اعتماد ہے ہم  
 بہت اچھے دوست ثابت ہوں گے۔  
 ”مجھ پر اعتماد ہے۔“ انہوں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ سروش نے  
 اثبات میں سر ہلایا۔ وہ تھوڑا سا جھکے اور دھیمے سے بولے۔ ”تو پھر مجھے بتا دو وہ کون  
 ہے؟؟ سروش نے عجیب سی ہو کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔



کالج میں سارا وقت نلیم اس کے پیچھے پڑی رہی۔ بات وہی ایک تھی۔ جو ہر  
 دوسرے تیسرے دن سننے میں آتی تھی۔ وہی مسئلہ جو عموماً درپوش رہتا تھا۔ نلیم کی بھر  
 مددان سے لڑائی ہو گئی تھی۔

بڑے غور سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جیسے اس کی سوچوں کو پڑھ لینا چاہتے  
 ہوں۔ جیسے اس کی دھڑکنوں کے معنی کچھ لینا چاہتے ہوں۔ جیسے اس کے من میں جھانک  
 لینا چاہتے ہوں۔ وہ ابھی خاموش ہی تھی کہ انہوں نے اپنا بڑا سا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر  
 اسے کئی بار ہلایا اور زور دار لہجے میں بولے۔ ”تمہاری خاموشی کہہ رہی ہے کہ تم محبت  
 کرنے لگی ہو۔“  
 سروش چونک گئی۔ وہ ان کی صاف گوئی پر کہہ کہ رہ گئی۔  
 وہ مسکرائے۔ ”تمہاری اس حیرانی نے بتایا ہے کہ میرا اندازہ سو فیصد درست  
 ہے۔“  
 سروش نے متنبہل کر کہنا چاہا۔ ”نہیں رضی بھیا! آپ تو ایسے ہی.....“ وہ بات  
 مکمل نہ کر سکی۔ اس کا لہجہ بے حد کمزور تھا۔ وہ ان سے لگاؤ میں چھری تھی۔  
 ”تمہارا یہ لگاؤ جانا بتا رہا ہے کہ جس سے تم نے محبت کی ہے۔ وہ خوش  
 قسمتی یا بد قسمتی سے میں نہیں ہوں۔ انہوں نے اس لہجے میں کہا کہ سروش کو بے ساختہ ہنسی  
 آ گئی۔  
 اور تمہاری اس ہنسی نے کہہ دیا ہے میرا یہ اندازہ بھی درست ہے۔ اور مجھے اپنی  
 ساری خوش فہمیاں اور غلط فہمیاں نہایت شرافت کے ساتھ دور کر لینی چاہئیں۔“  
 انہوں نے بڑے ہی پرسکون انداز میں کہا۔ تو سروش نے سراٹھا کر ان کی طرف غور سے  
 دیکھا۔ ان کے لفظوں کی سچائی ان کے چہرے پر جھک رہی تھی۔ وہ ان کا احترام کرتی  
 تھی۔ انہیں پسند کرتی تھی۔ ان کی موجودگی میں خوش رہتی تھی۔ لیکن ان کیلئے پسندیدگی  
 کے جذبات میں کبھی وہ شدت اور لذت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جو از خود اپنا آپ منوالیتی  
 ہے۔ جو زندگی کا رخ بدل دیتی ہے۔ جو وقت کا احوال موڑ دیتی ہے۔ جو سارے وجود  
 میں اتر جاتی ہے۔

سروش اس کے غیر متوقع سوال اور شریر انداز سے جھینپ سی گئی۔ پھر سنبھل کر بولی۔ ”میں تو تمہیں سمجھا رہی تھی نیلم۔ یہ روز روز لڑنا بھی تو اچھا نہیں۔“

”لیکن آپ کا انداز بڑا جہاںدہ ہے؟“ وہ اس کی بات کاٹ کر آنکھیں نہپاتی ہوئی بولی۔

”آپ کے اقوال ذریعہ سے تجربے کی سوئدھی سوئدھی مہک آ رہی ہے۔“ اس نے نکتے پھلا کر سوئدھے کی اداکاری کی۔

سروش گڑبڑا گئی۔ ”ایسے ہی بکواس نہ کیا کر۔“

”خیر ایسے تو میں بکواس نہیں کیا کرتی۔ آچار تاتے ہیں کہ کوئی بات ہے ضرور۔“ اس نے شرارت سے آنکھ دہائی۔ سروش بھیرا پہلو بچاتی رہی۔ لیکن نیلم اس کی جان کو آگئی۔ اسے شک ہو گیا تھا۔ اور اب وہ پچھا چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ سروش طرح دیتی رہی لیکن اس نے انکوار کر ہی دم لیا اور فرس کر بولی۔ ”ہوں!! تو آج کل تمہارے پریشانہ ہیں۔“

سروش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یونہی ہونٹ کھینچے مسکراتی رہی۔ نیلم نے اس کا ہاتھ پکڑا اور خوشدلی سے بولی۔ ”آؤ تمہیں کوک چاؤں۔ تمہاری پہلی محبت کا جام۔“ سروش کو ہنسی آگئی۔ اسے ٹھوکا دے کر بولی۔

”پہلی کیوں کہتی ہے۔“

دونوں کوک پی کر انھیں تو نیلم کو پھر عدنان کا خیال آ گیا۔ کیونکہ یہ آخری پیر لڑ تھا۔ وہ جلدی جلدی پھر اسے تمام معاملہ سمجھانے لگی۔ ”اے سروش! آج تو غضب ہی ہو گیا بڑی زبردست فائنٹ ہوئی ہے۔ اس نے تو دھکا دے کر مجھے کار سے نکالا۔ کہہ رہا تھا میں تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔ خیر لیا تو میں نے بھی نہیں کیا صاف کہہ دیا کہ میں بھی تمہاری منہوں شکل ہانکل نہیں دیکھوں گی۔“

عدنان اس کے بچپن کا ساتھی اور مہنگیتر تھا۔ دونوں میں محبت بھی تھی۔ لیکن اک دوسرے سے الجھنے کے موقع جیسے تلاش کرتے رہتے تھے۔ اکثر دونوں میں کسی معمولی بات پر ٹھن جاتی۔ ترکی بہ ترکی سوال جواب ہوتے۔ دونوں اک دوسرے کو بے نقطہ بناتے۔ منہ چرانے اور دھول جانے تک نوبت پہنچتی۔ دونوں ایک دوسرے کو کبھی نہ بات کرنے کی دھمکیاں دیتے۔ لیکن جلد ہی صلح کیلئے بے یمن ہو جاتے۔ اکثر یہ خوشگوار فریضہ سروش کو ہی انجام دینا پڑتا۔

سروش کو بھی دونوں کی تکرار میں بہت لطف آتا تھا۔ وہ بڑی خوش طبعی سے دونوں کے درمیان رابطہ بن جاتی۔ وہ بڑی زندہ دلی سے اک دوسرے کی شکایتوں کا دفتر کھول دیتے۔ اور صلح کر لینے پر بھی فوراً آمادہ ہو جاتے۔ آج بھی یہی معاملہ تھا۔ نیلم بڑی شدت سے اسے جھگڑنے کی تمام تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھی۔ اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ عدنان سے صلح کرنے کو بھی بے تاب ہے۔ سروش کو ہنسی آگئی اس کے ہنسنے سے وہ چن کر بولی۔

”تم ہنسے جاؤ اچھا۔ خوب مزے لو اور یہاں جان پر نی ہے۔ آج تو ہاتھ کاٹھہ کاٹ ہوئی ہے۔ بس اس عدنان کے بچنے کی ہی بات زبردستی ہے۔ بڑا حق جمانا ہے۔ اپنی طرف سے۔ کینہ جیسا۔“ وہ بظاہر اسے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ لیکن لہجے کی منہاس چھپی نہیں تھی۔

سروش مسکرائی۔ ”نیلم وہ تمہ سے محبت بھی تو کرتا ہے۔ تجھے یہ سب اچھا نہیں لگتا کہ اسے تیرا کتنا خیال ہے وہ تیری ذرا سی بے توجہی برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ تجھے خود سے وابستہ دیکھنا چاہتا ہے۔“

نیلم پلٹے پلٹے رک گئی اور اسے سر سے سر تک بڑے غور سے دیکھ کر بولی۔

”خیریت تو ہے ایسی حکیمانہ منگلو تو آج پہلی مرتبہ آپ کی زبان سے سنی ہے۔“

”ہائے اللہ! آپ دونوں کتنے دکھی ہیں۔ سروش نے مت سکھا کر کہا تو دونوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔

موڈ تو خوشگوار ہو گیا تھا۔ لیکن گھر پہنچتے ہی دونوں نے شکایت کے دفتر کھول دیئے۔ جو بات نیلم بیان کرتی اسے عدنان پر لے کر دے دیتے۔ گپ قرار دے دیتا اور جو شکایت عدنان کو ہوتی اسے نیلم سفید جھوٹ قرار دے دیتی۔ بہتیری بحث ہوتی۔ بڑی لے دے ہوتی۔ لیکن آخر کار دونوں صلح پر آمادہ ہو ہی گئے۔



”اچھا۔“ سروش نے ٹوکا۔ ”پھر کیوں کتنی ہے کہ صلح کرادے۔“  
نیلم کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بولی۔ ”کیا کروں میری جان بس ذرا دل کا معاملہ جو ہے۔“  
یوں تو دونوں نے اک دوسرے کی شکل نہ دیکھنے کی دھمکیاں دی تھیں۔ لیکن واہسی پر عدنان بڑی سعادت مندی سے نیلم کو لینے آ گیا۔ سروش کو ہمراہ دیکھا تو اس کے لبوں پر اک طرب انگیز مسکراہٹ آ گئی۔ مگر بظاہر اکڑا ہوا بیٹھا رہا۔ سروش نے کھڑکی میں جھانک کر اسے پہلو کہا اور وہ چپ چاپ گاڑی چلانے لگا۔

”عدنان بھائی!“ یہ آج موڈ کیوں خراب ہے۔ سروش نے شرارت سے

پوچھا۔

”پوچھئے اپنے پہلو میں بیٹھی ہوئی اس بندر یا سے۔ وہ جیسے اس کے سوال کا ہی

خنکر تھا۔

”اپنی صورت دیکھی ہے کبھی۔“ نیلم بھلا کس طرح خاموش رہتی۔

”تم سے تو اچھی ہے۔“ وہ ننگ کر بولا۔

”بڑی خوش جمی ہے“ نیلم نے چڑایا۔ ”کبھی آئینہ دیکھ لیا کرو.....“

”اپنے مشورے پر تم خود ہی عمل کر لو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔“ وہ بولا۔

”چلیز۔ عدنان بھائی! مجھے تو آپ کہیں اتار دیں۔“

سروش نے مداخلت کی۔

”ارے نہیں سروش بیگم! آج تو میں نے آپ کے سامنے بڑے دکھڑے

رونے ہیں۔ وہ حراجہ اعزاز میں بولا۔

”میں نے بھی اپنی دکھ بھری کہانی تمہیں سنائی ہے۔“ نیلم بھی اسی لہجے میں

بولی۔

”چلتے ہی ملائیے ہاتھ۔ عدنان بھائی آپ آگے۔“

سروش نے کہا: ”واہ۔ میں کیوں اٹھوں اس ٹیلم کی بیٹی سے کہنے کہ مابدولت سے آکر معافی مانگے اور اگر ہاتھ وغیرہ ملانا ہو تو وہ بھی ملے۔“ ..... عدنان بڑی شان سے بولا: ”ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔“

”دیکھو۔ دیکھو سروش! منع کرو اس کو۔“ ٹیلم نے احتجاج کیا۔

”ہوں..... ہوں عدنان بھائی بس اب اور کچھ نہیں کہتا۔“ سروش نے اسے

ٹوکا تو وہ ہائل خواہستہ اٹھا۔ ٹیلم نے براسمانہ بنا کر ہاتھ بڑھایا۔

”سروش بھی اے عدنان نے روہنسی آواز میں کہا۔ ”اب میں اپنی قسمت کو نہ

روؤں تو کیا کروں۔ ڈرامیری ہونے والی سز کی شکل تو دیکھئے۔“

سروش کو اس کے بے ساختہ پن پر ہنسی آگئی۔ ٹیلم بھی اپنی ہنسی ضبط نہیں

کر سکی۔ چائے وغیرہ لہا کر دونوں اسے چھوڑنے چلے تو بڑے خوشگوار سوز میں تھے۔ ٹیلم

نے اگلی نشست پر اسے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا۔ راستہ بڑی پر لطف چھیڑ چھاڑ میں

گنا۔ سروش گاڑی سے اترنے لگی تو عدنان نے ٹیلم کے شانے پر سے دیکھ کر کہا۔

”سروش! بہت شکریہ..... بڑی لوازش۔“

سروش نے چہرہ ہنسا کر اس کی طرف دیکھا اور خوشدلی سے بولی۔ ”اب کچھ

دن آرام سے نکل جانے دیجئے گا کہیں راستے میں ہی لڑانا نہ شروع کر دیجئے گا۔“

”اپنی دوست کو سمجھائیے۔“ عدنان نے ٹیلم کی طرف منہ چڑایا۔

”آپ بھی تو کم نہیں۔“ سروش نے اسے چھیڑا۔ تو اس نے پاس بیٹھی ہوئی

ٹیلم کو اس طرح دھکیلا کہ اس کا سر سروش کے سر سے جا ٹکرایا۔ سروش نے براسمانہ بنا کر

پیشانی سہلائی۔ ”بس عدنان بھائی اب نہیں بولوں گی آپ سے۔“

نہ..... نہ بھی لیجئے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے

مزاحیہ انداز میں بولا ورنہ ٹیلم کا خون آپ کے سر ہوگا۔“

سروش نے مسکرا کر انہیں خدا حافظ کہا اور باہر نکل آئی۔ وہ گاڑی سوزے گیا تیز

تیز چلتی وہ گلی میں مڑنے لگی تو آگ لے کر ٹھنک کر رہ گئی۔ اس کا دل پھول سا کھل اٹھا۔

اسے آج کا دن بڑی ہی خوبصورت اور روشن معلوم ہوا۔ وہ مجسم مسکراہٹ میں ڈھل گئی۔

اس نے چپکتی ہوئی آنکھوں سے عامر کی طرف دیکھا جو گلی کے کنارے کھڑا تھا۔ شاید وہ

آج ہی واپس آیا تھا۔ لیکن وہ اس کی مسکراہٹ کے جواب میں مسکرایا تک نہیں۔ اس کی

لگا ہوں میں ابہام تھا۔ وہ جذبہ جود کو زالی کیفیتوں سے آشنا کرتا تھا۔ ان خالی خالی

آنکھوں میں کہیں نہیں تھا۔ سروش نے پھر ایک بار پلٹ کر بے یقینی سے اس کی طرف

دیکھا۔ وہ اب تک وہیں کھڑا تھا۔ لیکن عامر کے بجائے کوئی اور شخص معلوم ہو رہا تھا۔

جسے وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔



سروش کے من میں اک ہلچل سی بیٹھی تھی۔ وہ تو سوچ رہی تھی کہ عامر اتنے

دونوں بعد واپس آئے گا تو اس سے ملنے ہوئے آنکھوں میں نہ جانے کتنے ستارے

چمکیں گے، رخساروں پر کتنے گلاب کھلیں گے۔ لبوں پر کتنے نغمے بچھیں گے، شاید کوئی

لفظ بھی وصل کی ان خوشیوں کو بیان نہیں کر سکے گا۔ ورنہ جذبات میں دونوں کو کچھ نہیں

اتفاقی اور انماض کے یہ مکرر دے لے اس پر قیامت بن کر گزر رہے تھے۔ اسی لئے شام کو اسے چائے دیتے ہوئے اس نے بڑے لگاؤ سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے عامر تم کچھ پریشان سے ہو۔“

عامر نے سراخا کر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں اور یونہی سر جھکائے ہوئے کرسی سے بولا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

”کوئی بات تو ہے نا جیسی آپ.....“ سروش کا جملہ ادھر اسی چھوڑ دیا۔  
 ”کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ درستی سے بولا جاؤ تم یہاں سے میرا مانع نہ کھاؤ۔

سروش نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ کہیں وہ مذاق تو نہیں کر رہا۔ لیکن اس کے چہرے کی بھنبلاہٹ، اس کے لہجے کی تلخی، وہ کچھ کہہ رہی تھی جو سروش کیلئے ناقابل برداشت تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے۔ اگر وہ کچھ اور کہنے کی کوشش کرتی تو یقیناً رو پڑتی۔ اسی لئے وہ پلٹ آئی اور غسل خانے میں تھسی ہوئی کتھی ہی دیر روٹی رہی۔ یہ بے اتفاقی، یہ انماض، یہ بے رخی اس کا معمول بن گیا تھا۔ اکثر وہ لوں میں کوئی بات نہ ہوتی اگر گفتگو کا موقع آ جاتا تو کتھی اور بیٹھی۔ وہ بہت کم گھر میں نکلتا تھا۔ عموماً رات گئے گھر آتا۔

سروش اک عجیب بے یقینی کے عالم میں تھی۔ نہ معلوم وہ کیا چاہتا تھا۔ اسے کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیوں بدل گیا تھا؟ وہ خود کو بہلاتی رہتی کہ شاید وہ مذاق کر رہا ہے۔ شاید وہ اس کو آزما رہا ہے۔ لیکن یہ کیسی آزمائش تھی؟ جس نے چاہت کی ساری مناس لوٹ لی تھی۔ محبت کے نرم و نازک قرینے جھین لئے تھے۔ بھول سا کھلا دل ریت کے صحرا میں تبدیل ہو گیا تھا۔ گرد و پیش سانا سا چھا گیا تھا۔ بھرے بھرے گھر میں وہ تنہا سی ہو گئی تھی۔ کھوئی کھوئی سی، ابھی ہوئی، پریشان جیسے راستہ بھول گئی ہو۔

سوٹھے گا۔ لیکن دلوں کی خوشی چہروں کو چاند بنا دے گی۔ نگاہوں کو جھمکا دے گی اور خامشی کو وہل کے گیتوں میں ڈھال دے گی۔

لیکن عامر تو وہ عامر معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ جسے اس نے چاہا تھا۔ جو اس کی زندگی بن گیا تھا۔ جو اس کی دھڑکنوں میں بسا تھا۔ لیکن اس کی نگاہوں کی اجنبیت نے اسے سہا دیا تھا۔ وہ محبت کرنے والی انہیان و شیرازوں کی طرح انجانے اندیشوں سے لرز اٹھتی تھی۔ لیکن خود کو بہلا رہی تھی کہ ابھی وہ گھر آئے گا تو اس کے سارے اندیشے، تمام دوسے اس کی چاہتوں کے سامنے بچھ ہو جائیں گے۔

وہ انتظار کی ڈوبتی، ابھرتی ساعتوں میں جھکولے لیتی رہی۔ لیکن عامر رات گئے تک نہیں آیا۔ اس کے کان اس کے قدموں کی آہٹ پر ہی گھے تھے۔ لیکن کوئی آواز اس کے آنے کی خبر نہیں دیتی تھی۔ وہ بہت دیر جاگتی رہی۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ پھر نہ جانے کب سو گئی۔



صبح کالج کیلئے تیار ہو کر نکلی تو اسے اپنے کمرے سے نکلنے دیکھا۔ اس کا حلیہ خاصا عجیب و غریب ہو رہا تھا۔ ہال بے ترتیب تھے۔ اور آنکھوں میں سرخی، شاید ابھی ابھی سوکر اٹھا تھا۔ سروش غیر ارادی طور پر اس کے قریب آئی اور گفتگو سے اسے صبح بخیر کہا۔

اس کی فراخ پیشانی پر اک ٹل سا آ گیا اور وہ اسے نظر انداز کر کے گزر گیا۔ وہ وہیں حیران سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کی اس بے اعتنائی پر سروش نکھر کر رہ گئی۔ اس کے انماض پر دل کی دنیا زبرد زبرد ہو گئی۔ وہ اس سے کھل کر بات کرنا چاہتی تھی۔ اس کی اس بے رخی کا سبب جاننا چاہتی تھی۔ اس کی غلط فہمیوں کو دور کرنا چاہتی تھی۔ بے

اس کے ساتھ کار میں چیتے ہوئے اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”عدنان بھائی مبارک ہو۔“

”شکر یہ جی!.....“ وہ منہ سوکھا کر بولا۔ قسمت کا کھٹا تو پورا ہو کر ہی رہتا ہے۔

سرروش اس کی اداکاری سے محفوظ ہوئی۔ بہت اچھی قسمت ہے آپ کی۔  
”یہ فقرہ آپ اپنی دوست سے کہئے اس پر زیادہ فٹ بیٹھے گا۔“ عدنان نے اس طرح برکت کہا کہ سرروش کے ساتھ ٹیلم بھی نہیں پڑی۔



وہ سامنے کے چھوٹے آئینے میں سے دیکھ کر بولا۔ آج کل کی لڑکیوں کا تو دیدے کا پانی مر گیا ہے۔ پر سوں شادی ہے۔ ہونے والا مظلوم شوہر سامنے بیٹھا ہے اور ان کی بیٹی نگلی پڑتی ہے۔

”جی ہاں۔ ہم تو بس کرسولی چڑھیں گے۔“ ٹیلم نے ترکی یہ ترکی جواب دیا۔

عدنان نے مسکرا کر گاڑی سٹارٹ کی اور انہیں مختلف بازاروں میں گھماتا رہا۔ لیکن دونوں کی جان اس نے آفت میں کر رکھی تھی۔ کچھ بھی تو آرام سے نہیں خریدنے دیتا تھا۔ ہر چیز میں سو سو کیڑے ڈالتا تھا۔ جلدی اس نے الگ چار کھی تھی۔ آخر ٹیلم کے ساتھ سرروش نے بھی کھری کھری سنا کیں تو وہ سب کچھ پھینک چمک گاڑی میں بیٹھ رہا۔ کچھ چیزیں ابھی خریدنا باقی تھیں لیکن وہ بس سے مس نہیں ہوا۔ منہ سوجانے گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ دونوں کو ساری خریداری بھی خود ہی اٹھانا پڑی۔ خدا خدا کر کے کہیں خریداری ختم ہوئی تو دونوں عدنان کو کوسیں گاڑی میں آن بیٹھیں۔ ٹیلم نے لمبا سانس



وہ بے طرح اداس ہو رہی تھی۔ اس نے سوچا تھا۔ کونسلیم سے بات کرے گی تو دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔

شاید وہ اسے بہلا دے گی۔ حامر کے دل میں جھانک لینے کی کوئی تدبیر بتا دے گی۔ لیکن وہ تو کالج ہی نہیں آئی تھی۔ سرروش اور بھی پریشان ہوئی۔ وقت گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ عجیب سی آکٹاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تو اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اور وہ حیران بیٹھی سوچ رہی تھی کہ محبت کے رنگ کتنے انوکھے ہیں، کتنے زرا لے، کتنے عجیب اور تھیر انگیز۔ کبھی یہ شعلہ ہے، کبھی شبنم، کبھی گل، کبھی خار، کبھی تبسم، کبھی آنسو۔

وہ ایک پیریا اس نے بمشکل گزارے اور اٹھ کر گھر چل دی۔ ابھی گیٹ تک ہی پہنچی تھی کہ ٹیلم آتی ہوئی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی اس سے لپٹ گئی۔ اس کے رخسار پر ایک پیار کر کے خوشی سے باپتی ہوئی بولی۔ آؤ چلو میرے ساتھ باہر عدنان لکڑا ہے۔  
”لیکن کہاں ٹیلم؟“ سرروش نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے خود سے علیحدہ کیا۔

”شاپنگ کیلئے۔“ وہ اسے اپنے ساتھ ٹھہرتے ہوئے بولی۔

”کس سلسلے میں۔“ سرروش نے پوچھا۔ بھی شادی ہو رہی ہے ہماری اسی بیٹھے وہ چنگلی بجا کر بولی۔ عدنان کو سا لرشپ مل رہا ہے میں بھی اس کے ساتھ ہی جاؤں گی۔  
سرروش دم بخود سی رہ گئی تو کیا ٹیلم چلی جائے گی۔ جو اس کی واحد دوست اور ساتھی تھی۔ جس سے وہ اپنے دل کی بات کہہ سکتی تھی۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی۔ ٹیلم اس کا بازو پکڑے اسے گیٹ کی طرف لے جا رہی تھی۔ اس کی زبان مسلسل چل رہی تھی۔  
اور وہ پھولے ہوئے سانسوں کے درمیان اسے بتا رہی تھی کہ انہیں شادی کی فوری تیاری کیلئے کیا کچھ خریدنا ہے۔

لے کر کہا۔ ”چائے پی کر چلیں گے۔“

”جی ہاں آپ کے نوکر ہیں نا جو سارا دن پیگم صلحہ کو ہی گھماتے رہیں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہونٹوں میں جھک مارنے کی سیدھے سیدھے گھر چلاؤ۔ وہ تو جیسے بھرا بیٹھا تھا۔ نیلم کا موڈ سخت خراب ہوا تھک کر بولی۔ ”ہم تو چائے پی کر ہی جائیں گے تم ہمیں مہراں پر اتار دو..... اور جاؤ۔“



نیلم کی دھمکی کارگر ہوئی۔ عدنان برا سا منہ بنا کر ایک ریسیورٹ کے باہر کا اور سروش نیلم کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔ دونوں ایک میز پر بیٹھیں تو وہ بھی گاڑی بند کر کے اندر آ گیا۔

”اب کیوں آئے ہو؟“ نیلم نے چھیڑا۔

”تمہارے لئے نہیں آیا۔ میں سروش کے خیال سے آ گیا ہوں۔“ وہ تھک کر بولا۔ ”سروش بھی تو میری دوست ہے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے اس کا خیال کرنے کی۔“ نیلم بھی تیز ہوئی۔

”ہے نا ضرور۔“

”کیا ضرورت ہے؟“

”اگر سروش نہ ہو۔ تو تمہارا نقل میرے ہاتھ سے ہو جاتا۔“ وہ مسکراہٹ چھپا کر بولا۔

”اور اگر سروش نہ ہوتی تو تم بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتے تھے۔“ نیلم نے جواب دیا۔

”شکر ہے میں تھی۔ رت دو نقل ہو جاتے۔“ سروش نے مزاحیہ انداز میں کہا تو دونوں ہنس پڑے۔

اسکی ہی خوشگوار ہاتھوں میں چائے پی گئی۔ جب وہ اٹھ کر دروازے کے قریب

سے مصافحہ کیا۔

نیلیم نے بے تکلفی سے پینکشن کی۔ "عامر صاحب! ہم سروش کو گھر چھوڑنے جا رہے ہیں۔ آپ نے چلنا ہوتا چلئے۔"

"بہت شکریہ! آپ لوگ چلئے۔ مجھے کچھ کام ہے۔" اس نے خوش اخلاقی

سے جواب دیا۔

وہ نیلیم کے ساتھ آگے بڑھ آئی۔ لیکن عامر کی نگاہوں کے کتنے ہی پیغام اس کے ساتھ ساتھ تھے۔

نیلیم اور عدنان کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ لیکن دوسرے روز جب وہ ایسے پرچی تو حسب عادت دونوں میں پھر ایک زوردار لڑائی ہو چکی تھی۔ نیلیم منہ پھلائے بیٹھی تھی اور عدنان نہ جانے کہاں غائب تھا۔

سروش نیلیم کو متاثر بیوی پارلر لے کر گئی۔ جب وہ تیار ہو کر آئی تو نہ صرف وہ خود بہت اچھی لگ رہی تھی بلکہ اس کا موڈ بھی اچھا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اندر آئیں۔ تو عدنان بھی آچکا تھا اور گنگناٹا ہوا جلی کی گڑھ لگا رہا تھا۔

سروش نے نیلیم کو پیچھے رکھنے کا اشارہ کیا اور خود دروازے پر دستک دے کر عدنان کو اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ آئیے۔ آئیے سروش کبھی ہیں آپ؟ وہ خوشدلی سے بولا۔

"میں تو ٹھیک ہوں۔ لیکن تیری نوپلی دلہن کو آپ نے کیوں ناراض کیا ہے؟"

"کیوں..... اس کو کیا تکلیف ہے؟" وہ انہجان بن کر بولا۔



آئے تو اچانک سروش کی نگاہ ریسنورنصر کے ایک گوشے میں گئی اور وہ ٹھنک گئی۔ عامر وہاں اکیلا بیٹھا۔ اسی جانب تک رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شلوک کی پرچھائیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔

تمام بات ایک دم ہی سروش کے ذہن میں روشن ہو گئی۔ اسے یوں لگا جیسے سر سے کوئی بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کا دل پھول سا ہلکا ہو گیا۔ عامر کی بے رخی نے دل پر جو قیامت ڈھائی تھی وہ اب ایک سرخوشی ہی بن کر وجود پر چھانے لگی تھی۔ اپنا آپ بے حد اہم معلوم ہونے لگا تھا کہ اس کی خاطر وہ اتنا پریشان تھا۔ عدنان کو ان کے ساتھ دیکھ کر وہ نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔

سروش دروازے کی طرف جانے کے بجائے نیلیم کا بازو پکڑ کر اس میز کی جانب چلی آئی۔ جہاں عامر بیٹھا ہوا تھا۔ عامر کچھ گڑ بڑایا۔ پھر اپنی نشست سے تھپہٹا اٹھا۔ نیلیم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ سروش نے جلدی سے کہا۔ "نیلیم! یہ عامر ہیں۔"

"اچھا تو یہ ہیں۔ عامر صاحب!" نیلیم نے مسکرا کر شرارت سے سر ہلا دیا۔

"بہت خوب ہیں بھئی عامر صاحب!" اس نے چھیڑا۔

عامر کچھ نہ سمجھتے ہوئے کبھی ایک کی طرف دیکھتا تھا۔ تو کبھی دوسرے کی

طرف۔ تب تک عدنان بھی آ گیا۔

"بھئی یہ کیا ہو رہا ہے؟"

سروش اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ عامر! یہ عدنان بھائی ہیں۔ اور یہ میری

بہت عزیز دوست نیلیم! اور دونوں کی مختصر شادی ہونے والی ہے۔" اس نے دیکھا

کہ عامر کچھ چڑکا ہے اور اس کی آنکھوں میں مفاہمت کا ایک رنگ اتر رہا ہے۔ اس کے

لہے دیے انداز میں بھی تندی کی جھلک نظر آئی۔ اور اس نے عدنان کے ساتھ گرجوٹی

آکٹری ہوئی اور اس کے گلے میں ہاتھیں ڈال کر بولی۔

”اسے سروش! تیرا دطر بڑا بے، کیسا ہے؟“

سروش کے رخسار شہبالی ہو گئے۔ گلابی ہونٹ کا اک گوشہ اس نے دانتوں تلے ڈال لیا۔ نیلم نے اس کے رخسار پر ہنگلی لی۔ سروش اس کی طرف پلٹ گئی۔ اتنی باتیں، اتنی بہت سی خوبصورت باتیں، اتنی بیادری باتیں، سہارنی مجال تھیں۔ لیکن لیوں پر لاتا بھی مشکل تھا۔ اس نے سر نیلم کے شانے پر رکھ دیا اور ہولے سے بولی۔ ”نیلم میں تجھے کیا بتاؤں؟“



نیلم اسی بیٹے عدنان کے ساتھ لندن چلی گئی تھی۔ سروش اس کے جانے سے تنہا ہی ہو گئی۔ لیکن عامر نے شب و روز میں کچھ ایسا رنگ بھردیا تھا کہ تہائی کا احساس ہی منت گیا تھا۔ دن بڑے سہانے ہو گئے تھے۔ لمحے بہت اپنے اپنے سے تھے۔ ہر پہل بڑا رتھیں تھا۔ اچانک مل جانے والے تھنے کی طرح جو اپنے دامن میں کتنے ہی رنگ برنگی خوشیاں چھپائے ہوئے ہوتا ہے۔

زندگی ایک دلر با خواب سا معلوم ہونے لگی تھی۔

سروش سب کچھ بھول کر اس میں کھو گئی تھی اسے گرد و پیش کا کچھ احساس نہیں تھا کہ اچانک یہ دلر با پسنا اک پلٹا میں حقیقت کی گتھی میں بدل گی۔ سروش کو اب معلوم ہوا تھا کہ فرقت کی آگ کس طرح خرمین دل کو جلا کر ناکستر کر دیتی ہے۔ وہ خود کو کسی لئے ہوئے مسافر کی طرح تھی دامن اور تنہا پائی تھی۔ گرد و پیش کی ساری رونقیں رخصت ہو گئی تھیں۔ پھولوں سے خوشبو، ستاروں سے چمک، چاند سے چاندنی اور دھنک سے رنگ کھوئے گئے تھے۔ اور وہ اک محرومی کی سی کیفیت میں سانس لے رہی تھی۔

سروش نے پکا سا بتا کر کہا۔ ”رورعی ہیں بیٹی ہوئی۔ چاہیے سنا میں جا کر وہ تو تیار بھی نہیں ہو رہی بہت ناراض ہے۔“

”سناؤں گا تو کیا ہی دو بھانپڑا نہ کھالے مجھ سے۔“ وہ ڈیرنگ روم کا پردہ کھینچ ہوا بولا۔

نیلم جھینپ کر پیچھے ہٹ گئی۔ عدنان نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ کھل سا گیا۔ بازوؤں سے پڑ کر اس نے نیلم کو سامنے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

”کیوں بھئی سروش! یہ کون ہے؟ نیلم شرماسی گئی۔ سروش نے خوش مزاجی سے کہا۔“

”آپ بتائیے؟ آپ کی دلہن ہے۔“

عدنان نے شرارت سے جھک کر نیلم کا چہرہ دیکھا۔ جو دلور تھاب سے گلزار ہو رہا تھا۔ اور ہنستے ہوئے بولا۔ ”ارے واقعی یہ تو کچھ خوب صورت بھی ہو گئی ہے۔“ نیلم کا سین چہرہ دکھ اٹھا۔

سروش نے جلدی سے کہا۔ ”واہ بھلا وہ خوبصورت کس دن نہیں تھی؟“

”یہ تو ہمارا دل ہی جانتا ہے۔“ وہ مزاحیہ پن سے بولا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے کمرے سے جاتے ہی وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ نیلم کا دھنکا ہوا خوبصورت چہرہ شوخ رنگوں سے چمک رہا تھا۔ وہ اس کے برابر

عامر کے گھر والوں نے اسے عامر کیلئے مانگ لیا تھا۔ وہ اس کیلئے ہیرے کی خوبصورت انگوٹھی لائے تھے۔ وہ بار بار اپنے دل سے سوال کرتی تھی۔ خود سے بے قیمتی کے عالم میں پوچھتی تھی کہ کیا عامر اس کا ہو گیا ہے؟

تھناؤں کے دلکش روپ، انگلیوں کے نزلے رنگ حجاب کی سرخی اور مسرت کی چمک نے اس کا چہرہ چاند سا روشن کر دیا تھا۔ اسے اپنا وجود اک بیٹھا ہر گیت معلوم ہوتا تھا۔ اس نے عامر کو پالیا تھا۔ وہ تنہا بیٹھ کر اس کے بارے میں سوچتا چاہتی تھی۔ وہ اس کے تصورات میں کھو جانا چاہتی تھی۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتی تھی منگنی کی انگوٹھی کو نحویت سے دیکھتے ہوئے وہ نہ جانتے کیا سوچ رہی تھی کہ نازش نے آ کر اس کے کان میں کہا۔

”رضی بھیا! آئے ہیں۔“

”کون؟ کہاں.....؟ وہ چونک گئی۔“

”لو دو تو آگے ہیں رضی بھیا۔“ وہ اتنا کہہ کر بھاگ گئی۔ مہمانوں سے بھرا ہوا گھر اسے حق تو سنبھالنا تھا۔ آج وہ بے حد مصروف تھی۔ سروش اٹھ گئی۔ یہ بھلا رضی بھیا کیوں آگے ہیں؟ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ قریب آچکے تھے۔

”ہیلو ہیلو وہیں بیگم!“ انہوں نے خوش دلی سے کہا۔ سروش جھینپ گئی۔ وہ ابھی تک منگنی کے کپڑوں میں تھی۔ اس نے شرما کر رخ پھیر لیا اور دھبے سے بولی۔

”رضی بھیا! شرم آ رہی ہے مجھے۔“

آہا!!! تو شرمانے کا لمبا پروگرام ہے۔“ انہوں نے ہازد سے پکار کر اسے اپنی جانب کھلایا۔ میں تو تمہیں دیکھنے آیا ہوں تم شرما رہی ہو۔“

حجاب کی شرکس کیفیت نے اس کے حسین چہرے کو گھٹا کر دیا۔ اس کے جھکے جھکے سے دلکش چہرے پر چھوٹا سا جھکے جھول رہا تھا۔

”اسے لڑکی! تم تو بہت خوش ہو۔“ انہوں نے جھک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

عامر سے رفاقت کے سبب مجھے بس ایک ہی پل معلوم ہوتے تھے۔ ایک خوبصورت لمبے کی طرح ذہن میں کہیں جاگتے تھے۔ اور اس سے آگے جدائی کی طویل اور تھکا دینے والی طویل ساتتیاں تھیں جو صدیوں پر محیط تھیں۔ وہ ان اذیت ناک لمحوں کے سامنے خود کو بڑا ہی کمزور اور بے بس محسوس کرتی تھی۔ یہ پڑیوں کو چھینا دینے والی گھنٹیاں اک امتحان معلوم ہوتی تھیں۔ وہ طرح طرح کے اندیشوں اور وسوسوں کے درمیان پس کر رہ گئی تھی۔ وہ خود سے بار بار ایک ہی سوال کرتی تھی۔

”کیا وہ عہد مر کو پالے گی؟“

جدائی کی ان کرناک ساتتوں میں اسے تنہا چھوڑتے ہوئے عامر نے اسے ایک بار اپنے بازوؤں میں لے کر کہا تھا۔ ”سروش اس کے بعد ہم کبھی نہیں چھوڑیں گے۔“

وہ سرشار سی ہو گئی تھی۔ وہ اس ایک چھوٹے سے لمبے کے سہارے پوری زندگی بنا سکتی تھی۔ چاہت کے اس امر لمبے کو دل میں بسائے وہ جدائی کے تق وحق صحرا میں پہرہوں چل سکتی تھی۔ وہ ہر لمبے اس کے ساتھ تھا۔ روح کی گہرائیوں میں، دل کی دسمتوں میں وہی تو تھا۔ وہ رات کے تاریک لمحوں کو اس کی یادوں سے روشن کرتی چلی جاتی۔ اس کے گرد و پیش چراغاں سا ہو جاتا۔ وہ اس کے تصور میں کھوئی کھوئی، اس کے سپنوں کی آس میں سو جاتی۔ یہ سپنے کبھی حقیقت بن جائیں گے۔ اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ خواب کبھی سچ ہوں گے اسے یقین نہیں تھا۔ یہ تصورات کبھی اس کے اپنے ہو جائیں گے۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس کی مانگ ستاروں سے بھری تھی۔ رنگوں اور خوشیوں کی برسات میں وہ شرابور ہو گئی تھی۔ اس کی دھڑکنوں میں نغمے اٹھنے لگے تھے۔ سرسبز اور شاہ بانیاں ننھی مٹی پر یوں کی طرح یہاں وہاں اس کے آگہن میں اترنے لگیں۔

کی لطفوں میں کھو کر وہ ان تلخ حقیقتوں کو فراموش کر بیٹھی تھی۔ عامر کو اپنا سمجھ کر وہ سارے رشتے بھول گئی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ محبت کے سوا اسے کچھ نہیں چاہئے۔ لیکن اب..... اب تو عامر اپنا ہو کر بھی اپنا نہیں لگتا تھا۔

جب وہ ابو مصروف دیکھتی۔ امی کو پریشان دیکھتی تو خود کو مجرم سمجھنے لگتی۔ اس کیلئے اس کے چاہئے والے سکھ و صوفی نے ڈھونڈنے خود دکھوں کی آگ میں جل رہے تھے۔ بنی کا محبت بھرا وجود ان کیلئے بوجھ بن گیا تھا۔ تنگرات نے ان کی نیندیں اڑا دی تھیں۔



ان ہی دنوں عامر کو اپنی فرم کی طرف سے چند ماہ کے دورے پر باہر جانے کا موقع ملا۔ وہ سروش کو بھی ہمراہ لے جا چاہتا تھا۔ اس کے گھر والے چند ہفتوں میں ہی شادی کر دینے پر زور دینے لگے۔ ہر دوسرے تیسرے دن ان کا کوئی نہ کوئی پیغام آ جاتا۔ صفدر صاحب کی تو جان پر بن گئی تھی۔ امی الگ پریشان تھیں۔ ان کے پاس تھا ہی کیا جو بیٹی کو دلہیز سے اٹھاتے۔ بڑی دقتوں سے اس کے گھر والوں کو ڈالا گیا کہ ابھی ان کی تیاری مکمل نہیں ہے۔ وہ لوگ بھی شاید جیتی جہیز کی آس میں تھے۔ اسی لئے تموزی پس و پیش کے بعد مان گئے۔

لیکن عامر کا موڈ سخت خراب ہوا تھا۔ جانے سے پہلے وہ اسے ہوٹل میں ملا تو سخت بھنجیلا ہوا تھا۔ اور اس کی ہر بات کا الٹ جواب دے رہا تھا۔ سروش جو اس کے جانے کے خیال سے افسردہ ہو رہی تھی اور دل برداشتہ ہو گئی وہ اس سے کس طرح کہہ رہی کہ اس کے والدین کے پاس اس کے جہیز کیلئے کچھ نہیں ہے جو وہ اسے رخصت

سروش نے جواب نہیں دیا۔ صرف مسکرا کر رہ گئی۔ انہوں نے ہولے سے کہا۔  
”سروش! خدا کرے تم اسی طرح مسکراتی رہو۔“

ان کے لہجے میں کوئی ایسا بات تھی کہ سروش نے پلکیں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا اور چند لمحے سختی رہی۔ وہ بھی اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دھیسے سے انداز میں انہوں نے بڑے لگاؤ سے کہا۔ ”بہت اچھی لگ رہی ہو سروش!“



مرا دونوں بھرے دن پر لگا کر اڑے جاتے تھے۔ وہ مطمئن سی ہو گئی تھی۔ بڑی ہی آسودہ۔ ہر شے سے بے نیاز۔ اس کی محبت اسے مل گئی تھی۔ عامر اس کا دکھایا تھا۔ اب اسے کچھ اور نہیں چاہئے تھا۔ قسمت اس پر مہربان تھی۔ اپنے ستاروں بھرے آنکھ کا سایہ اس پر ڈالے تھی۔ اس کی راہوں میں پھول بچھائے تھی۔  
وہ سمجھتی تھی کہ عامر سے منسوب ہو کر اسے کسی شے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ کوئی کی نہیں رہے گی، کوئی فکر نہیں ہوگی۔

لیکن جب تصورات کی دنیا سے نکل کر پہنوں سے چمک کر اس نے سر اٹھایا تو کتنی ہی تلخ حقیقتیں منہ کھولے کھڑی تھیں۔

اب پہلے سے زیادہ مصروف رہنے لگے تھے۔ امی کو دن رات یہی فکر کھائے جاتی تھی کہ اس کے جہیز کے لئے پیر کہاں سے آئے گا؟ گھر میں کوئی ایسی خوشحالی نہیں تھی۔ صفدر صاحب کی تنخواہ میں بمشکل گزر رہی ہوتی تھی۔ عامر کا خاندان اچھا، خوشحال اور کھانا پیتا تھا۔ ملنے جلتے والے سروش کے ہاتھ میں ہیرے کی انگلی دیکھتے تو کہتے ہیرے کی انگلی لانے والے جہیز بھی دیا ہی مانگیں گے۔ سروش پریشان ہو اٹھی۔ اسے اب معلوم ہوا تھا کہ کسی کو چاہ لینا کتنا آسان ہے؟ لیکن اسے پانا کتنا مشکل ہے۔ محبت

اس کے دل کی باتیں دل میں رہ گئیں تھیں۔ اس سے مل کر وہ پہلے سے بھی زیادہ ادا اور ہو گئی تھی۔ عامر اسے انجی سا معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کی بے قرار محبت دل کے کسی دور دراز کے گوشے میں جا سوئی تھی۔ وہ حیران ہو کر سوچتی تھی کہ محبت تو اصول ہے انسان تو لازوال ہے پھر اس کی قیمت کیوں لگائی جاتی ہے۔ پر غلوں جذبوں کو سونے میں کیوں تو لایا جاتا ہے؟ کیا اس کی اپنی شخصیت، اس کی خصوصیات، اس کی محبتوں کی کوئی وقعت نہیں۔ زندگی جن لطیف جذبوں سے مہارت ہے کیا ان کی کسی کو ضرورت نہیں۔

سروش کا جی چاہتا کہ عامر سے ایک بار پوچھ تو لیتی کہ اسے کیا چاہئے۔ لاکھوں کا جہیز؟ یا اس کی رفاقت؟ لیکن ایک عامر کے کہہ دینے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ راہ میں اور بھی تو کتنے لوگ تھے۔ وہ کس کس کو سمجھاتی، کس کے مقابل آتی۔ اسے خود سے نفرت ہونے لگی تھی۔ محبت پر سے اس کا اعتبار اٹھنے لگا تھا۔ محبت تو کچھ بھی نہیں تھی۔ معاشرہ اس کی رکشیں اس کی روایتیں ہی تو سب کچھ ہیں۔ دل میں کوئی جذبہ کوئی انگ نہیں رہی تھی۔

بہت سوچ سوچ کر سروش نے ایک مقامی کالج میں ملازمت کر لی۔ وہ گھر والوں کا بوجھ ہٹانا چاہتی تھی۔ وہ اس احساس جرم سے نکلنا چاہتی تھی جس نے زندگی کو روگ لگا دیا تھا۔ جس نے محبت جیسے امر جذبے کو گھنا دیا تھا۔

کردیں۔ وہ چاہتی تو تھی کہ اس معاملے پر اس سے گفتگو کرے۔ لیکن وہ جھجکتی ہی رہی۔ اسے یہ سب کچھ کہتے ہوئے عیب سی سکی کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی لئے وہ اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ عامر سے یہ ملاقات بڑی ہی تیز رہی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اس سے ملی ہی نہیں۔



پاکستانی پبلسٹیشن

اچھی لڑکی تھی۔ لیکن سروش اس کے گھر جانے سے کتراتے تھے۔ اس کی محل نما کوٹھی، تکلفات سے بھری ہوئی فضا۔ وہ یہ سب دیکھ کر اوب سی جاتی تھی۔ اپنی کم مانگی کا احساس اپنے آپ ہی شدید ہو جاتا تھا۔ وہ اتنا سی جاتی تھی کہ اس جیسا وہاں کوئی بھی نہیں ہوتا تھا۔ اسی لئے وہ وہاں جانے سے کتراتے تھی۔

لیکن صدف نے آنے کا اتنا اصرار کیا کہ اسے وعدہ کرتے ہی بنی۔ اب وہ اتنے خلوص سے مدد کر رہی تھی تو بار بار انکار کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسی لئے اس نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور زیب کے ساتھ سر جوڑ کر اسے دیئے جانے والے تھے کے بارے میں سوچنے لگی۔

اگلی شام زیب اسے لینے کے لئے پہنچی تو اس کی جگہ دھج دیکھنے کے لائق تھی۔ کاہدار ساڑھی کے ساتھ جڑاؤ لگو بند بہت اچھا لگ رہا تھا۔ دونوں ہاتھوں میں اس نے کتنی ہی قیمتی انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں۔ میک اپ بھی شوخ اور سلیقے سے کیا ہوا تھا۔

”ارے آج صدف کے سسرال والے دھوکا ہی نہ کھا جائیں۔“ سروش نے اسے چھیڑا۔

وہ آنکھ دہا کر ہنسی اور تنقیدی نظروں سے سر سے پیر تک اس کی طرف دیکھا۔ اس نے باری پٹی کی نیلا ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کا میک اپ مدہم تھا۔ سادگی سے بندھے ہوئے جوڑے میں ایک سفید بھول لگا تھا۔

”جناب! آپ منگنی میں جا رہی ہیں اور وہ بھی اس شہر کے رئیس کی بیٹی کی۔“

کچھ پتہ بھی ہے۔“ زیب نے آنکھیں نیچا کر کہا۔ سروش نے کچھ جواب نہیں دیا۔ یونہی مسکرا دی اور اس کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔

صدف کا محل نما گھر روشنیوں سے بھرا رہا تھا۔ ہر طرف گہما گہمی اور چہل پہل

کالج میں اس کا دل خوب لگ گیا تھا۔ گھر میں کچھ آسودگی ہو گئی تھی۔ امی کے نظرات بھی کچھ کم ہو گئے تھے۔ اب انہیں اطمینان ہوا تھا کہ اس کا جہیز آسانی سے تیار ہو جائے گا۔ وہ ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگی رہتی تھیں۔ ریزہ ریزہ کر کے جوڑتیں اور اس کے لئے منگنی ہی خوشیاں خریدتی رہتیں۔

سروش کی ساتھی پیگمزرز اس سے عامر کے متعلق پوچھتی تو اس کے من میں کلیاں ہی چمک اٹھتیں۔ اس کا ہی چاہتا کہ کوئی عامر کی باتیں کہے جائے اس کے بارے میں پوچھے اس کا نام لے لے کر چھیڑے۔

زیب تو سب میں بہت شوخ تھی۔ جلد ہی اس کے ساتھ دوستی بھی ہو گئی تھی۔ وہ بڑی خوش مزاج اور بے فکری تھی۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتی رہتی تھی۔ کسی نہ کسی شغل میں لگی رہتی کوئی نہ کوئی ہنگامہ چائے کھتی۔

آج بھی اس نے صبح سے شور مچا رکھا تھا کہ صدف کی منگنی کیلئے کیا کیا تیاریاں کی جائیں گی؟ کون سا تھخریا جائے اور کیا کیا پروگرام بنائے جائیں؟ سروش نے تو صاف انکار کر دیا۔ ”بھئی مجھے تو تم معاف ہی رکھو۔ اس عجیب و غریب فلسفاتی ماحول میں میں خود کو بالکل ایڈجسٹ نہیں کر سکتی۔ وہ لوگ تو مجھے اس دنیا کے باہر معلوم ہی نہیں ہوتے۔ اس قدر اداست اتنا مصنوعی پن جیسے چادر دگری میں چلے آئے ہوں کہ کسی شے کو چھوٹیں گے تو پتھر کے بن جائیں گے۔“

زیب کو بہت ہنسا آیا۔ ”چ کر بولی۔“ یہ ساری بکواس تو صدف کے ساتھ ہی کرنا۔ وہ آج آ رہی ہے کارڈ اپنے۔“

”دیکھی جائے گی۔“ سروش نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ صدف، زیب کی گہری دوست تھی۔ اس کے ذریعے ہی سروش سے حعارف ہوئی تھی۔ بڑی ملنسار اور

مورتمیں لڑکیاں ہائیاں ہستیں، پھتیں ہاتیں کرنی قہقہے بکھیرتی پھولوں کے مگرے بیٹھی  
 ادھر ادھر شاعر نشستوں پر بیٹھ رہی تھیں۔ وہ کھڑکی سے گئی باہر دیکھتی رہی۔ اسے وہ دن  
 یاد آ رہا تھا جب اس کے چھوٹے سے مگر میں ایسا ہی جیتی جاگتی رہتی تھی۔ وہ کئی نئی  
 بیٹی تھی عامر کی امی اس کے پاس جھیں اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنا رہی تھی اور عامر کی  
 شریر فنی اسے پھیڑ رہی تھی۔ اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ ہر طرف ایسی  
 ہی چہل پھل تھی۔ لیکن کتنی ہی اپنی اپنی سی جوں کی گہرائیوں میں سرت کا احساس چکا  
 دیتی تھی۔ وہ بظاہر کھڑکی پر کھڑکی باہر دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہوں میں وہ حسین لمبے  
 بے تھے۔ جن کو چشم تصور سے جب چاہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ شہری یادوں نے اس کے  
 دلکش چہرے پر ایک تانناک سی چمک بکھیر دی تھی۔

اچانک کسی نے اسے بازو سے پکڑتے ہوئے جھنجھلا کر کہا۔ "صفت آپ  
 یہاں کھڑکی کیا کر رہی ہیں۔" وہ چونک کر بٹھی اور سراسیمہ سی ہو گئی۔ اس کا مخاطب بھی  
 نجل سا ہو کر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور محضرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ "اوه صاف کھینچے۔"  
 سروش نے اک اجنبی سی نگاہ اس کے اونٹھے لیے سراپے پر ڈالی اور وہاں سے  
 ہٹ جانے کو قدم بڑھایا۔ لیکن اسے تھم جانا پڑا۔ گھبرا کر اس نے پیچھے دیکھا۔ اس کی  
 ساڑھی کا آچھل تیل میں الجھ گیا تھا۔

وہ جو جانے کیلئے قدم بڑھا چکا تھا۔ مگر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے ہی وہ  
 ڈوپٹہ چھڑانے کیلئے کھڑکی کے قریب آئی وہ بھی اسی طرف بڑھا۔ سروش نے غلت میں  
 پلو چھڑا لینا چاہا لیکن جلدی اور گھبراہٹ میں وہ اور بھی الجھ گیا۔

"ظہر بے..... آرام سے۔" اس نے بھاری آواز میں شائستگی سے کہا اور

جھک کر دھبے سے اس کا پلو چھڑا دیا۔

تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے رنگوں خوشبوؤں اور روشنیوں کی دنیا آباد ہے۔ کئی نئی  
 ملازما کیں انہیں صدف کے کمرے میں لے گئیں۔ وہ بڑے تپاک سے ملی۔ اس کی رشتہ  
 دار لڑکیوں نے بڑی تعقیدی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا۔ زیب تو اکثر یہاں آتی  
 رہتی تھی اس لئے کچھ اس سے متعارف بھی تھیں۔ لیکن سروش سے وہ پہلی دفعہ ملی تھیں۔

صدف نے تعارف کرایا۔ مسکراہٹوں کے تبادلے ہوئے اور گویا جان پہچان  
 ہو گئی۔ ان میں سے اکثر نے سروش کو پسندیدگی سے دیکھا۔ وہ نکلی ساڑھی میں بہت سچ  
 رہی تھی۔ زیب تو ان میں مکمل مل گئی۔ لیکن سروش اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتی تھی۔ یہ  
 ذرق برق فضا، یہ پر تکلف، حوصل اور تک سب سے درست بنے سنورے لوگ سب ہی  
 بڑے اجنبی مظلوم ہوتے تھے۔ یونہی دل میں اپنی کم باتیں کا احساس پیدا کر دیتے تھے۔  
 وہ ان سب کے درمیان خاموش سی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ نہیں  
 تھا۔ وہ ان کے انداز ان کے طور طریقوں ان کی آواؤں سے مانوس نہیں تھی۔ وہ تو جیسے  
 اجنبی رہیں میں آگئی تھی۔ وہ سب آہیں میں خوش گیمیاں کر رہی تھیں اور وہ چپ چاپ  
 بیٹھی ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ قہقہہ لگاتیں تو وہ مسکرا دیتی۔ نہ اسے کسی نے مخاطب  
 کیا نہ ہی وہ خود کسی سے مخاطب ہوئی۔

اچانک باہر پھل سی جگ تھی۔ شاید مہمان آ گئے تھے۔ کسی ملازم نے دروازہ  
 کھول کر پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ اطلاع دی تو وہ سب باہر نکلیں۔ سروش کو بھی  
 اٹھنا پڑا کہ وہ بھی لڑکیوں کے اک رہیلے کے ساتھ باہر آگئی۔ کچھ لڑکیاں تو باہر مہمانوں  
 کے استقبال کیلئے تیل دیں اور کچھ کھانسیوں میں کھڑکی ہو گئیں۔ سروش بھی چپکے سے اک  
 کھڑکی میں آن کھڑکی ہوئی گا بی پھولوں والی ایک خوبصورت تیل چڑھی ہوئی تھی۔

کتاب کے غرواروں، جھلسل کرتی ساڑھیوں اور کامدانی ڈوپٹوں میں لپٹی ہوئی

استنے ہجوم میں سروش پھنس کر رہ گئی۔ کوئی چہرہ بھی شناسا نہیں تھا۔ زیب کا بھی کچھ پتہ نہ تھا۔ وہ بے انتہا بے ریت محسوس کر رہی تھی۔ وہ اکتا رہی تھی۔ کوئی اس کا ساتھ دینے والا نہیں تھا۔ کوئی اس کے جیسا اس کی زبان میں اس کے انداز میں بات کرنے والا نہیں تھا۔ ایک عجیب ڈانوس سا ہنگامہ تھا۔ جس میں بڑی گھٹن سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد گھر واپس جانا چاہتی تھی۔ وہ اس فضا سے باہر نکل کر تازہ ہوا میں سانس لینا چاہتی تھی۔

وقت گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہجوم سے الگ ہوتی ہوئی وسیع ہال کی دیوار پر گئی ایک تصویر دیکھنے لگی۔ جو کسی جانے پہچانے مصور کی بنائی ہوئی معصوم ہوتی تھی۔ اس نے غور سے دیکھنا پڑھنے کی کوشش کی۔

”بہت پسند آئی آپ کو یہ پینٹنگ۔“ اس کے عقب سے آواز آئی۔

وہ چونک کر مڑی۔ وہ اس کے عین مقابل تھا۔ وہی جس نے اس کی سازمی کا پلو چھڑایا تھا۔ سروش نے خوبصورت سیاہ آنکھوں کو بھپک کر ہولے سے کہا۔

”جی ہاں۔ بہت خوبصورت ہے۔“

”آپ یہاں عجا کیوں کمزری ہیں؟“ اس نے استفسار کیا۔

سروش نے گردو پیش دیکھا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ہولے سے ہنسا۔

”دیکھ لیجئے یہاں آپ کے سوا کوئی نہیں۔“

”شکریہ!“ سروش نے میکانگی انداز میں کہا اور تیز قدم اٹھاتی صدف کے کمرے کی طرف چل دی۔

صدف تیار ہو چکی تھی۔ خاندان بھری لڑکیاں اس کے گرد جھکنا کئے اسے باہر لے جانے کو بے قرار تھیں۔ سنہری کرن کے ہالے میں صدف کا خوبصورت چہرہ بے پناہ مسکین لگ رہا تھا۔ جھومر نیکہ لگائے وہ کوئی شہزادی سی معلوم ہوتی تھی۔

سروش بھی اک جانب خاموشی سے بیٹھ گئی۔ بیروں کے زویرات سے لدی پھندی عورتیں خوبصورت لباس سرسراتیں اپنی انگلیوں میں پہنی ہوئی قیمتی پتھروں کی انگوٹھیوں کی نمائش کرتیں زمانے بھری باتیں کر رہی تھیں۔

صدف کو خوبصورتی سے سجے ہوئے ہال میں لے جایا گیا۔ مہلق کی ریسیں ادا ہوئیں۔ لڑکیاں دلہا دلہن کو دیکھنے کیلئے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتی تھیں۔ سب کی کوشش تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ تصویروں میں نظر آسکیں۔



”کیوں ابو! آج تو سب لوگ جاگ رہے ہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا!“



کمرے میں تنہا بستر پر پڑی وہ بڑی اداس ہو رہی تھی۔ دل پر غبار سا چھایا تھا۔ چند دنوں میں ہی اس کا بھرا ہوا گھر اس کے اپنے اس سے الگ ہو گئے تھے اور وہ آنسوؤں سے نم آنکھیں لئے سوچ رہی تھی کہ زندگی میں اک ذرا سا سکھ حاصل کرنے کو کتنے دکھ جھیلنے پڑتے ہیں۔

ابو کسی چھکانہ سازش سے زیر اثر آ گئے تھے اور ان کی ٹرانسفر ایک چھوٹے سے شہر میں ہو گئی تھی۔ ان کے آرام کے خیال سے سارا گھر بھی ان کے ساتھ ہی منتقل کرنا پڑا تھا۔ لیکن سروش کو یہیں رہنا پڑا تھا۔ اور ملازمت ملا مشکل تھا۔

ہوسٹل میں ابھی کمرہ خالی نہیں تھا۔ اسی لئے اسے زیب کے یہاں رہنا پڑا تھا۔ لیکن ان سب سے بچھڑ کر وہ بڑی ہی مفہوم اور اداس ہو رہی تھی۔ دو تین مہینے میں بھی وہ خود کو عادی نہیں بنا پائی تھی۔ اسے اپنا وہ چھوٹا سا خوبصورت گھر وہ محبت سے بھری نضا، راجہ اور جگنو کی شرارتیں۔ امی کا محبت بھرا سایہ ابو کی مشفق نگاہیں نازش کی دوستانہ چاہت۔ بڑی شدت سے یاد آتے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پلک جھپکتے میں ان سب کے درمیان چا پینچے جو اس کے اپنے تھے۔ جن سے اہل رشتے اور خوبصورت محبتیں وابستہ تھیں۔ وہ لا انتہا جھپکتیں وہ لافانی رشتے۔ جن کے سوتے بھی خشک نہیں ہوتے۔ جن کے خزانے کبھی خالی نہیں ہوتے۔ جن کی گونا گوں کیفیات کو دور یاں اور فاصلے فزوں تر کر دیتے ہیں۔ دل کی گھرائیوں میں انہیں اور بھی جاگزیں کر دیتے ہیں۔

جب اداسیاں اسے چادوں جانب سے گھیر لیتیں تو وہ خود کو بہلائی خود کو تسلی

سروش نے دور بھوم کی طرف دیکھا جو دلہن کو جھرمٹ میں لئے تھا اور سادگی سے بولی۔ ”مجھے بھوم پسند نہیں۔“

”کیوں۔“ اس نے شاید گنگو کو طول دینے کیلئے پوچھا۔

سروش چپ سی ہو گئی۔ وہ بھلا اسے کیا جواب دیتی۔ وہ شاید کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دور سے آتی ہوئی زیب اسے دیکھ کر اسی طرف چلی آئی۔

”بھی تم کہاں رہ گئی تھی؟“ اس نے دور سے ہی پکار کر کہا۔

سروش قدم بڑھا کر اس کے قریب چلی گئی۔ زیب نے اسے بھی دیکھ لیا تھا۔

اس لمبے گر جھوٹی سے بولی۔ ”ہیلو عام بھائی! کیسے ہیں آپ؟“

”شکریہ!“ وہ خوش اخلاقی سے بولا۔ ”آپ کیسے کیسی ہیں؟“

کچھ دیر وہ اس سے دیکھ کر نارہا پھر آگے بڑھ گیا۔

زیب نے مسکرا کر اسے ٹھوکا دیا۔ ”اے! یہ صدف کے بھائی سے کیا باتیں

ہو رہی تھیں؟“

”اچھا تو یہ صدف کا بھائی ہے۔“ سروش کو اب پتہ چلا تھا۔

ہاں سو فیصدی۔ زیب نے شوقی سے کہا۔ ”کیسا ہے تیرے مامے سے اچھا ہے

کہ نہیں۔“

سروش ٹال گئی۔

کہیں رات گئے تقریباً مٹم ہوئی تو زیب اسے گھر پہنچا گئی۔ گھر کی نرم گرم

نضا میں اسے عجیب سی آسودگی کا احساس ہوا۔ کپڑے تبدیل کر کے جب وہ امی کے

کمرے میں آئی۔ تو دیکھا خلاف معمول اتنی رات گئے۔ سب جاگ رہے ہیں۔ اس

نے ایک لمبے میں محسوس کر لیا۔ کہ سب کچھ خاموش بھی ہیں۔ نازش اور راجہ سخت بیزار

شکلیں بنائے بیٹھے تھے۔ وہ ابو کے پاس پلنگ پر جا بیٹھی اور شکر سی ہو کر بولی۔

جس روز ان کی بارات جانی تھی اس دن تو اک حشر پیا تھا۔ بھاگ دوڑ و دم تیل جی تھی۔ سب کو اپنی اپنی پڑی تھی کسی کو کپڑے نہیں مل رہے تھے، تو کسی کا سینڈل غائب تھا، کسی کے لباس سے ہم رنگ لپ اسٹک کھو گئی تھی، تو کسی کی نیل پالش کسی دوسرے کے لباس پر دھبے چھوڑ گئی تھی۔

سروش سب سے پہلے تیار ہو گئی۔ اس نے گہرا براؤن سوٹ اور چاندی کے بڑے بڑے ہالے پہنے تھے۔ سیدھی ساڑھی چوٹی میں لمبی سیدھی مانگ نکالے وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر تو وہ دوسری لڑکیوں کو تیار ہونے میں مدد دیتی رہی پھر چپکے سے اکیلی باہر نکل آئی۔

رضی بیٹا اپنے کمرے میں تھے۔ قیص کے کار اٹھانے ٹائی کی گرہ لگا رہے تھے۔ انہوں نے آہٹ پر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔

”آؤ آؤ سروش!“

سروش نے فس کر کہا۔ ”بیلورضی بیٹا کیسے مزاج ہیں؟“

وہ ڈٹی کی گرہ لگانے بغیر ہی گھوم کر اس کے سامنے آ گئے ان کے چہرے پر چھائی ہوئی غیر معمولی سنجیدگی سے سروش کچھ سنایا ہی گئی اور پگھلیں جھپکا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ ان کا پسندیدہ رنگ پہنے تھی۔ چاندی کے ہالے اس کے رخساروں سے چھو رہے تھے۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں ہلکا سا ہراس تھا وہ چند لمحوں سے اس کی طرف دیکھتے رہے وہ کچھ شینا کر یونہی فس پڑی۔ انہوں نے گونے پچھے سے سج اس کے شانوں سے پھسلنے آنکھ کو اٹھا کر اس کی گردن کے گرد مل دیتے ہوئے اس کے جھینپے ہوئے گلابی چہرے کی طرف دیکھا اور ہولے سے بولے ”سروش تم خوش ہو بہت۔“

وہ ان کے ہاتھوں سے اپنا آنکھ چھڑاتی ہوئی بولی۔ ”کیوں رضی بیٹا مجھے خوش نہیں ہونا چاہئے۔“

دیتی۔ اس کی ملازمت اس کے سارے گھر کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر اس کا جینز تیار ہونا ممکن نہیں تھا۔ جینز جو ایک دیوار بن کر عام اور اس کے درمیان حائل ہو گیا تھا۔ اسے اس دیوار کو پانا تھا۔ اسے اپنے بوزھے باپ کا بوجھ ٹانا تھا۔ اسے اپنی تنگ ماماں کے نظرات کم کرتے تھے۔

زیب کے یہاں اسے ہر طرح کا آرام تھا۔ لیکن اپنے گھر کی ہی راحت تو کہیں نہیں ملتی۔ جہاں کی بے ترتیبی میں بھی اک صحن اور کھار ہوتا ہے۔ جہاں کے ہنگاموں اور شور میں سکون و طمانیت کے خزانے ملتے ہیں۔ وہ کچھ تھپائی پسند ہی ہو گئی تھی۔ پیروں اپنے کمرے میں تھالی چھت کو کھورتی رہتی۔ تھپائی کے ان لمحوں میں عام کا تصور اسے سرور سا کر دیتا اور وہ مسکرا مسکرا کر آنے والے وقت میں جھانکتی رہتی۔

زندگی میں اک ٹھہراؤ سا بیہا ہو گیا تھا۔ معمول میں یکسانیت تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وقت پر اک جمود سا خاری ہو گیا ہے۔ عام کے کورس کے چھ مہینے جیسے چھ صدیاں مضموم ہوتی تھیں۔ اک اک دن رک رک کے گذرتا تھا۔ بڑا اسی بے رنگ اور سروش خاصی بور ہو گئی تھی کہ اچانک رضی بیٹا کی شادی طے ہو جانے کی خبر ملی۔ اسے بے حد خوشی ہوئی اک عرصے بعد کسی خانہ دانی تقریب میں سب کے مل بیٹھنے کا موقع آ رہا تھا۔ اس نے بیٹھے بھر کی چھٹی لی۔ اور خوشی خوشی وہاں جا پہنچی۔ اک عرصے کی خاموشی اور بوریت کے بعد اس ہنگامے میں بڑا لطف آ رہا تھا۔ سب لڑکیاں مل کر دن بھر اودھم مچائے رکھتیں۔ اٹنے سیدھے گانے گائے جاتے۔ ڈھولک جتنی شرارتیں ہوتیں۔ رضی بیٹا سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی۔ وہ راجہ اور دوسرے لڑکوں کی مدد حاصل کرتے اور ان کی شوخیوں کے جواب میں خوب ہنگامہ مچا کرتے۔ یہاں تک کہ وہ سب زچ ہو جاتیں اور کسی نئی سازش کا پروگرام بنانے لگتیں۔

وہ بے دلی سے مسکرائے اور پیکٹ پکڑنے کے بجائے انہوں نے اس کی کلائی پکڑ لی اور کچھ روٹھے روٹھے سے بولے۔ ”تمہیں یہ تحفہ ضرور دینا ہے مجھے۔“

”کیوں نہ دوں؟“ اس نے شوخی سے پوچھا۔

”دل تو چاہتا ہے تمہاری ہڈی پہلی ایک کروں کیسی۔“

بلاوجہ آ جانے والے غصے کو دبانے کیلئے وہ دانت چیں کر بڑبڑائے۔ جسے سروش نہیں سن سکی اور مستغفرانہ نگاہوں سے ان کی جانب دیکھنے لگی۔ انہوں نے پیکٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ وہ مسکراتی ہوئی پلٹ گئی۔ رضی بھیا ہونٹ دانتوں تلے وہاں کچھ دیر پیکٹ پکڑے ہوئے ناجانے کیا سوچتے رہے۔ پھر کھولے بغیر اسے میز پر ڈال دیا۔



رضی بھیا کی شادی کے بیگانوں سے لوٹی تو کالج کی وہی ٹی بندھی زندگی اور تنگ معمولات اور بھی بے مزہ معلوم ہوئے وہ گروہ پیش سے بیزار۔ اچانک دل لئے سب کے ساتھ گزرے ہوئے خوشگوار لمحوں کے درمیان سانس لیتی رہی۔

اس طرح بد مزہ اور بیزار ہونے کی وجہ اک اور بھی تھی۔ عامر نے کچھ بھیجا تھا کہ اسے اک اور کورس کیلئے وہاں چھ مہینے رکنا پڑے گا۔ اس نے اپنے خط میں اسے خوب ہی بے نقط سنا کیں تھیں۔ وہ بھی اس کے بغیر بے حد اداس اور بے مزہ تھا۔ سروش بے حد اداس ہوئی اس نے کیسے کیسے پتہ نہیں دیکھے تھے۔ کس کس طرح اسے یاد نہیں کیا تھا۔ لیکن جب اسے ملنے کے دن قریب آ رہے تھے تو اس نے مفارقتوں کا پیام بھیج دیا تھا۔ اسے انتظار کے انہماگ میں پھر جلا کر دیا تھا۔

امی یہ سن کر مطمئن ہو گئی تھیں کہ انہیں اور وقت مل گیا تھا۔ اب انہیں یقین تھا

”ہونا تو چاہئے لیکن اتنا بھی نہیں۔“

انہوں نے انگلی سے اس کا رخسار چھوا۔

”یہ خوبصورت سا ڈیپل تمہارے گالوں سے ملے ہی ناں۔“

سروش نے مجھب ہو کر ہونٹ کاٹ لیا اور بات بدلنے کو بولی۔ ”رضی بھیا!

آپ بہت اچھے لگ رہے ہیں۔“

”لو اور سنو۔“ وہ غصے۔ ”میں ابھی پورا احمق بنا ہی کب ہوں جو تم نے مجھے نظر

لگانی شروع کر دی ہے۔“

”خیر آپ اتنے اچھے بھی نہیں لگ رہے کہ نظر ہی لگ جائے۔“ وہ بھی ہنسی۔

”اچھا۔“ انہوں نے مصنوعی حیرت سے کہا اور پھر قدرے جھک کر رازداری

سے بولے۔ ”اور تم ان چاندی کے بالوں کے ساتھ اتنی اچھی لگ رہی ہو کہ نظر لگانے

کوئی چاہتا ہے۔“

سروش کچھ لپکا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور پشت کے پیچھے چھپایا ہوا پیکٹ ان

کے سامنے کر دیا۔

”یہ لیجئے۔“ وہ بولی۔

پتہ نہیں کیوں رضی بھیا ایک دم سے کچھ بیزار سے ہو گئے ان کا جی چاہا کہ اس

کو تھڑک دیں، اسے ڈانٹ دیں، اسے اپنے سامنے سے ہٹ جانے کو کہیں۔

”یہ کیا ہے؟“

وہ کوشش کے باوجود لہجے کو نرم نہ بنا سکے۔

”واہ رضی بھیا!“ اس نے مصنوعی سراپستگی طاری کرتے ہوئے آنکھیں

پھیلائیں۔

ایک تو آپ کو تحفہ دیا اور ہر سے ڈانٹ بھی رہے ہیں۔“

”کیا بک بک لگا رہی ہے۔ اتنی زبردست دعوت ہے طرح طرح کے لوگ ہوں گے بڑا حرا آئے گا۔“ زیب نے ہنکارا لے کر کہا۔

”میرا نہیں وہاں دل لگتا۔“ سروش نے بے دلی سے کہا۔

”تجسبیں کون کہتا ہے وہاں دل لگاؤ۔“ زیب نے شرارت سے آنکھ ماری۔

”بک مت۔“ سروش نے اس کا منہ چڑایا اور غسل خانے میں گھس گئی۔

اس عالیشان محل میں تو وہ قدم رکھتے ہوئے بھی ہنکچاتی تھی۔ خصوصاً اس قسم کی

تقریبات میں تو وہ اور بھی بیزار ہوتی۔ زیب تو وہاں لوگوں میں گھل جاتی۔ لیکن وہ

کسی سے اتنی بے تکلف نہیں تھی۔ صدف بھی سہانوں کی وجہ سے اتنی توجہ نہیں دے پاتی

تھی۔ اسی لئے اسے تقریبات میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔

یہاں ہر طرف شان شوکت، لٹائش اور چمکا چمندی نظر آتی تھی۔ چہل پھل

چمک دکھ، گہما گہمی اور غیر مانوس خوشبو۔ اسے بوکھلا دیتے۔ یوں معلوم ہوتا جیسے یہاں

موجود ہر چہرے سے مسکراہٹ چمک کر رہ گئی ہے۔ وہ غیر ارادی طور پر ہی ان سے اپنا

موازنہ کرنے لگتی تھی۔ اپنی کم مائیگی کا احساس سوا ہوا جاتا تھا۔ وہ ہنستے کھینچتے لگتے ہوئے

نفسوں سے معمور ماحول میں بڑی ہی دل شکست اور رنجور ہو جاتی۔

صدف بھی اس کے پاس سے کب کی اٹھ کر جا چکی تھی۔ زیب کا کچھ پتہ نہیں

کہ عامر کے گھر والوں کے مطالبات پورے کئے جا سکیں گے جو وہ بالواسطہ اور بلاواسطہ پیش کرتے رہتے تھے۔ انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کے شاہان شان جھجھتیار ہو سکے گا۔

سروش افسردگی سے سوچتی کہ دو دلوں کے ملنے کو ان رسوں اور رہا جوں نے کتنا دشوار بنا دیا ہے۔ وہ مغموم سی ہسٹر پر اوندھی پڑی جا جانے کن سوچوں میں الجھی تھی کہ زیب نے آن کر اسے گھسیٹ کر اٹھایا۔

”اٹھنا ہے کہ نہیں تمہیں۔“ وہ چلائی۔

”کیا مصیبت ہے بھئی؟“ سروش سخت بیزار ہوئی۔ بکواس نہ کرو اور تیار

ہو جاؤ۔ جناب صدف سے تو تم نے بھی وعدہ ہی کیا تھا نا کوئی قسم تھوڑی کھائی تھی۔“

سروش نے منہ بتایا۔ ”چھوڑو کوئی بہانہ کر دیں گے۔“



آیا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں نہیں بیٹھے بیٹھے آپ اس طرح بیٹھی ہوئی بہت اچھی لگ رہی ہیں۔ کاش ہمارے پاس کبیرہ ہوتا۔“

سروش نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی مسکراہٹ بے ضرر تھی۔ وہ بہت کچھ صدف سے مشابہ تھا۔ اور خاصا شاندار انسان تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھ کر بولا ”اپنا کھل تعارف تو کروائیے۔ مجھے تو آپ کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہے کہ آپ صدف کی دوست ہیں۔“

”کیا اتنا کافی نہیں ہے؟“ سروش نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بے تکلفی سے بولا۔ ”یہ تو کافی نہیں کم از کم تعارف کے ابتدائی مراسم تو طے ہو جانے چاہئیں۔“

”یعنی۔“ سروش نے بے نیازی سے کہا۔

”بہیں اک دوسرے کا نام تو معلوم ہونا چاہئے تاکہ مخاطب کرنے کے آداب پورے ہو جائیں۔“ اس کا انداز اتنا مہذب تھا کہ سروش کو ناگوار نہیں ہوا۔ وہ ذرا سا خم ہو کر بولا۔ ”مجھے مہم کہتے ہیں۔“

”میرا نام سروش صدف ہے۔“ اس نے پھولوں سے جھکی ہوئی کبیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”خوبصورت نام ہے۔“ وہ بولا لیکن سروش نے توجہ نہیں دی۔ وہ بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر خمبیری آواز میں بولا۔ ”آپ یہاں تنہا کیوں بیٹھی ہیں۔“

سروش نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ یہاں تنہا کیا کر رہے ہیں۔“ اس کے سوالات سے بچنے کو اس نے اسی کا سوال لوٹا دیا۔

تھا۔ سبھی اس ماحول میں مدغم ہو چکے تھے۔ مسکراہٹوں کے ترنم ہر طرف بکھرے ہوئے تھے۔ قہقہوں کے چھتا کے سنائی دیتے تھے۔ سروش آگیا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ دیواروں پر لگی تصویروں کو دیکھتی ہوئی وہ ہال کے پچھلے دروازے کی طرف آگئی اور شیشے میں سے باہر دیکھا۔ دور تک سبز روشیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے آہستگی سے کواڑ دھکیلے اور بغیر کچھ سوچے باہر آگئی اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی قفس سے باہر نکل آئی ہو۔

سبز روشوں پر کھلے ہوئے خوش رنگ پھولوں سورج کی شفق آلود کرنوں میں اپنے اصلی رنگوں سے مختلف اور چمکیے نظر آرہے تھے۔ ہلکی ہلکی خوشبو سے بوجھل تنک ہوا اسے چھوتی ہوئی گزری تو وہ تروتازہ ہوئی۔ وہ آہستہ خرابی سے سبز روش پر اتر آئی اور فطرت کے بے پناہ حسن کو نگاہ میں سیٹھنے لگی۔

معتد ہوا میں گہرے گہرے سانس لیتی وہ کتنی ہی دیر یونہی بیٹھی رہی۔ مختلف روشوں اور قطعات میں گھومتی رہی۔ تازگی، خوبصورتی، خوشبو اور آسودگی کی اتنی بے بہا دولت پا کر وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور خوشبو کی طرح معتد محسوس کر رہی تھی۔ چند لمبے ستانے کو وہ بارہ دری کی حلقہ میڑھیوں پر آ بیٹھی۔ یہاں بیٹھے ہوئے اس شاندار گھر کا پچھلا حصہ نظر آتا تھا۔ دور تک پھیلے ہوئے باغات کا سلسلہ آہستہ روی سے بہتا ہوا پانی، نقل، نقل بولتا ہوا موتی برساتا ہوا یہ سبھی کچھ اک سہانے خواب کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔

شفق کی سرخی اس کے رخساروں میں اتر آئی تھی۔ ڈوبتے سورج کی زرد کرنوں سے اس کی خوبصورت آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسی وقت اسے احساس ہوا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ فضا میں چمکتی تباہ کوئی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اسے کچھ دور صدف کا بھائی عامر کھڑا تھا۔ جانے وہ کب یہاں

”انسان اپنے متعلق زیادہ بہتر رائے قائم کر سکتا ہے۔“

پھر تو اس کا وہیمان خامیوں ہی کی طرف رہتا ہے۔ اسے خوبیوں کا احساس نہیں ہوتا۔“

”خامیوں پر نگاہ رکھنے والے خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے سے محفوظ رہتے ہیں۔“ سروش نے قلعی لہجے میں کہا اور تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی بیڑھیاں چڑھ گئی۔

پارٹی سے آ کر دونوں ٹالین پر ہی انٹی سیدھی لیٹ رہیں اور پارٹی میں شریک لوگوں ان کے ملبوسات اور دوسری باتوں پر تبصرہ کرنے لگیں۔ زیب نے سرعوب ہو کر کہا۔ ”خیر پارٹی تھی بڑی شاندار۔ شہر کے اچھے سے اچھے لوگ وہاں موجود تھے۔“

سروش نے اثبات میں سر ہلایا اور بازوؤں پر چہرہ دکھ لیا۔ وہ بہت تھک گئی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنا چاہتی تھی لیکن زیب کا تبصرہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ وہ باتیں کرنے کے موڈ میں تھی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو زیب نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور کھینچا۔ اسے کان سے لگایا اور سروش کی طرف بڑھا کر بولی۔ ”لو سنو۔ تمہارا فون ہے۔“

”میرا فون؟“ سروش نے اٹھ کر بیٹھے ہوئے ریسیور کان سے لگایا انا نام بتایا۔ دوسری جانب رضی بھیا تھے وہ جس جس کران کی خبریت دریافت کرنے لگی۔ آج بہت دنوں بعد ان کی آواز سنی تھی تو بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے وہ زور سے چلائی۔ ”کیا کہہ رہے ہیں رضی بھیا۔ نہیں۔ نہیں۔“ ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

زیب گھبرا کر اٹھی اور اس کے قریب آئی۔ ”کیا ہوا سروش۔ کیا ہوا۔“ اس

وہ محفوظ ہوا۔ ”اچھا سوال ہے۔ لیکن پہلے میں نے پوچھا ہے اس لئے پہلے آپ ہی جواب دیں گی۔“

سروش نے صاف گوئی سے کہا۔ ”بچی بات تو یہ ہے کہ میں نہ تو اس قسم کے ماحول کی عادی ہوں نہ مجھے ایسی تقریبات میں جانے کی عادت ہے۔ بس صدف کے اصرار پر آتا ہوں۔ وہاں میرا دل نہیں لگ رہا تھا اس لئے یہاں آ گئی۔“

”ہم اس ماحول کے عادی تو ہیں۔ لیکن جلد اکتا جاتے ہیں۔ سو چا ذرا کھلی فضا میں چل کر اک سگریٹ پلایا جائے۔“ اس نے از خود وضاحت کی۔

”جی ہاں۔ یہ جگہ بہت خوبصورت ہے۔“ سروش نے سادگی سے کہا۔

”آپ کو پسند آئی ہے تو ضرور ہوگی۔“ وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔ ”ویسے محتاط ہے آپ کی۔ سروش پھر خاموش ہو گئی۔ کہنے کیلئے کوئی بات تو تھی نہیں نہ ہی کوئی ایسا موضوع تھا جسے چھیڑا جاسکتا۔ شاید وہ کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا کہ وہ کوئی بات کرے گی لیکن وہ خاموش ہی رہی تو اس نے مخاطب کیا۔

”آپ بہت سنجیدہ ہیں۔“ اس نے کہا تو سروش گھڑی دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جیسے اپنے آپ سے بولی۔ ”اب چلنا چاہئے۔ صدف کو تو علم بھی نہیں کہ میں یہاں ہوں۔“

”آپ کو بتا کر آنا چاہئے تھا وہ آپ کیلئے پریشان ہوں گی۔“ حاتم نے کہا۔

میں کوئی ایسی اہم ہستی تو ہوں نہیں جس کی کمی کا احساس فوراً ہو جائے۔ شاید صدف کو پتہ بھی نہیں ہوگا؟ اس نے عام سے لہجے میں کہا۔

”آپ خود تو اپنے بارے میں مائے قائم نہیں کر سکتیں۔ اس کا اندازہ تو دوسرے لگا سکتے ہیں۔ وہ اپنے سے لہجے میں بولا۔

کمرے میں سامان بے ترتیبی میں پڑا تھا سلوٹوں سے بھرے ہوئے بسز پر وہ اونٹنی پڑی تھی۔ دنیا کتنی بے ثبات ہے بے حقیقت، فریب کی مانند۔ وہ دیکھے ہوئے دل کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ ابو کے گھڑ جانے نے اس کے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ زندگی ایسی بے رنگ، بیکلی، ناگوار اور ناقابل برداشت ہو گئی تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لینے کو جی چاہتا تھا۔

وہ حال ہی میں ہاسٹل منتقل ہوئی تھی۔ زیب اسے سمجھا سمجھا کر بارگئی تھی۔ ابھی اس کی ذہنی حالت اس قابل نہیں ہے کہ وہ تمہارے لیکن اسے تو اک ضدی ہو گئی تھی۔ وہ خود تری کی سی کیفیت میں مبتلا تھی۔ وہ اذیت پسند ہو گئی تھی۔ وہ ہر وقت کراہتی رہتی تھی۔ غموں کو نونہلی اور خون جگر جیتی تھی۔ کالج سے آ کر اونٹ سے منہ چنگ پر لٹتی رہتی۔ دوپہر سے شام ہو جاتی اور شام سے رات وہ اٹھ کر جی نہیں جاتی۔ اکثر کھانا کھائے بغیر ہی سو جاتی۔ اس کی طبیعت گری گری سے رہنے لگی تھی ہر وقت کڑھنے سے بڑی تلخ ہو گئی تھی۔ وہ یوں مضمحل اور زرد ہو گئی تھی جیسے بیمار ہو۔ وہ اسی غم میں گھل گھل کر مر جانا چاہتی تھی۔

ابھی کالج سے آئی تھی اور کھانا کھائے بغیر ہی بسز میں دراز ہو گئی تھی۔ سر بڑی طرح پکرا رہا تھا۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ طبیعت بہت نڈھال ہو رہی تھی۔ اس نے میز پر پڑے ہوئے خط اٹھائے اور دیکھنے لگی۔ ایک خط عامر کا بھی تھا۔ جسے دیکھ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ابو کے انتقال کے بعد یہ اس کا پہلا خط تھا۔ وہ خط کو کھولے بغیر کتنی ہی دیر ہاتھ میں لے کر دیکھتی رہی۔ اسے تحفظ کا گرما دینے والا احساس ہوا۔ اسے

نے پریشانی سے پوچھا۔ رہے پورا اٹھا کر کان سے لگایا۔ لیکن رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ اس نے پھر سروش کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ وہ پٹنی پٹنی آنکھوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”سروش۔ سروش۔“ کچھ تاؤ تو صحیح۔ کیا بات ہے۔ زیب نے کئی بار اس کے کمال چہتپتے تو اس نے یوں خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے پہچان نہ پائی ہو اور وحشت زدہ آنکھیں جھپکاتے ہوئے جیسے خود سے بولی۔ وہ کہتے ہیں کہ ابو۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ زیب سب کچھ سمجھ گئی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر اسے اپنے شانے سے لگایا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ وہ خود کو اس سے الگ کرنے لگی۔ زیب نے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا اور اس کے ٹھنڈے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ اس کی گردن ایک جانب ڈھلک گئی تھی وہ اسی گرفت میں بھول رہی تھی۔

ابو کے بغیر گھر بڑا سونا اور اجاز ہو گیا تھا یوں معلوم ہوتا تھا جیسے سوچے سمجھے کی سب صلاحیتیں سلب ہو گئی ہیں۔ دل میں اک خوف سے بیٹھ گیا تھا۔ کسی انجانے حادثے کی سنسنی کانونوں میں گونجتی تھی گھر کی وہ بیٹنی بائتی خوشیوں سے لبریز زندگی سے معمور نضا آسب زدہ ہی معلوم ہونے لگی تھی۔ سب کے چہرے یوں ستے ہوئے تھے جیسے زندگی کی ساری نشانیاں اس امد و ہتاک حادثے نے جھین لی ہوں۔ سنانے، خاموشی اور وحشت کا بھوم چارو نظر آتا تھا۔ سانس بیٹے ہونے لگی ڈر لگتا تھا۔ اونٹنی آواز میں بولنے سے دل ہولنا تھا۔ سب اپنے آپ کو یوں غیر محفوظ خیال کرنے لگے تھے۔ جیسے درود یوار نہیں ابھی نہیں کر رکھ دیں گے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے کڑی دھوپ میں بے سایہ کھڑے ہیں۔

وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اس میں جینے کی آرزو ماند پڑ رہی تھی۔ اسے حالات سے مقابلہ کرنے کیلئے بڑی دقت سے خود کو سنبھالنا پڑتا تھا۔ عامر کی بے وفائی پر اس نے ایک آنسو بھی نہیں بہایا تھا۔ سب کچھ چھین گئی تھی۔ اپنے منہ کا استحسان لیتے لیتے نڈھال ہو گئی تھی۔

ابھی کالج سے آئی تھی۔ یونہی آرام کرسی پر بیٹھی نا جانے کیا سوچ رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے جیسے جیسے ہی بیزاری سے دروازے کی طرف دیکھا۔ کسل مندی سے بولی۔ ”دروازہ کھلا ہے۔“

کواڑ کھلے اور رضی بھیا کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ ٹھنک کر دروازے میں ہی کھڑے ہو گئے تھے اور اسی طرف دیکھتے ہوئے فکر مندی سے بولے۔ ”سروش۔ کیا ہوا ہے تمہیں کتنی زرد ہو رہی ہو؟ بیمار رہی ہو کیا؟“

”نہیں تو رضی بھیا! میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے بے نیازی سے سر جھٹک کر خود پر قابو پایا۔ رضی بھیا کو دیکھ کر خوشی ہی ہوئی تھی۔ لیکن رونے کو بھی دل چاہ رہا تھا۔

وہ کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل ہی بیٹھ گئے ان کا انداز کچھ اوپر اوپر سا تھا۔ وہ بار بار اسی جانب دیکھ رہے تھے۔ سروش نے یونہی بات کرنے کو پوچھا۔

”تو صیف بھالی کہی ہیں؟ انہیں ساتھ نہیں لائے۔“

”نہیں۔ میں خاص طور پر تم سے ملنے آیا ہوں۔“ وہ بے حد سنجیدگی سے

ڈھارس ہی ہو گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کا بھی سہارا ہے۔ دنیا میں وہ تنہا نہیں ہے۔ کوئی اس کا ساتھ دینے والا ہے۔ اس کے غموں کو ہلکا کر دینے والا۔ اس کی السردگی کو زائل کر دینے والا۔

اس نے سب سے پہلے عامر کا خط ہی کھوا اور ایک ہی نظر میں غفلت میں لکھا ہوا دو مختصر خط لکھی بار پڑھ گئی۔

ڈیز سروش!

”میں بھالے بنا بنا کر، جز آ گیا ہوں۔ سوچتے ہوں تمہیں حقیقت سے آگاہ ہی کروں۔ میں نے اپنی ایک کلڈس فیلو سے شادی کرنی ہے اور سبک رسبے کا ارادہ ہے۔ شاید تم اسے سوس کرو۔ لیکن میری مجبوری سمجھ کر۔ کچھ خیال نہ کرنا۔“

عامر!



”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”اس نے خود ہی لکھا ہے۔“

وہ بظاہر لاپرواہی سے بولی۔ لیکن لہجے کی خشکی چھپی نہیں تھی۔ رضی بیٹا نے بڑے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا بظاہر وہ بڑی پرسکون نظر آتی تھی۔ لیکن آنکھوں میں کچھ کھودینے کا لال سا جھلکا تھا۔ انہیں بے حد دکھ ہوا۔

”جی چاہتا ہے شوٹ کروں اس الو کے پٹھے کو۔“ انہوں نے غصے سے کہا۔

”جانے بھی دیں رضی بیٹا کیوں اس بے چارے کو کوئی رہے ہیں۔“ وہ اس کا ذکر نہیں سنتا چاہتی تھی۔

”بے چارا۔“ انہوں نے چڑ کر کہا۔ ”تف ہے تو مشرقی لڑکیوں پر۔ مجیب

محبت ہے تمہاری۔ اونہ۔ اس کو کچھ مت کہیں۔“ انہوں نے اس قدر غصے سے کہا کہ سروش بے ساختہ ہنس پڑی۔

”پگلی ہو تم تو۔“ انہوں نے رنجیدہ ہو کر کہا۔ ”یہ اچھا نہیں ہوا۔ تمہاری پوزیشن پر اثر پڑے گا سروش۔“

”ایسے ہی پوزیشن پر کیا اثر پڑتا ہے۔ سارے ہی لڑکے باہر جا کر شادیاں کر لیتے ہیں یہ کوئی نئی بات ہے کیا۔“

”پھر بھی سروش اچھی بات نہیں ہے۔ میں تمہارے لئے بہت فکر مند ہوں۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھے۔

”اچھا جی ہوا رضی بیٹا وہ خود ہی الگ ہو گیا۔ اب تو میری ذمہ داریاں اور ہیں۔ میں سارے گھر کو اس کے لئے چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ وہ بھی شاید اتنا انتظار نہ کر سکتا۔ رضی بیٹا ابو کے بعد ساری ذمہ داری تو مجھ پر ہے۔“ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے جھللائی تھیں۔

بولے۔

”زہے نصیب!“ سروش نے قہقہے پیدا کرنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سنجیدہ ہی رہے۔ مسکرائے تک نہیں۔ ان کے چہرے پر دکھ کا گہرا سایہ تھا وہ کچھ سوچ رہے تھے یوں جیسے کچھ کہنے کیلئے لفظ تلاش کر رہے ہوں۔

”کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں آپ۔ رضی بیٹا نمہریے۔ میں چائے بنا لاؤں آپ کیلئے۔ پھر آرام سے بات کرتے ہیں۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”نہیں۔ نہیں۔ رہنے دو۔“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر اس کا بازو پکڑ لیا اور بولے سے اس کا ہاتھ چھتیا کر بولے۔ سروش! سروش۔ تم عامر کے متعلق کوئی بات۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ اٹکے۔

”میرا مطلب ہے تم اس کے متعلق کوئی ناگوار بات سن سکتی ہو۔“

سروش کا چہرہ ایک دم اتر گیا۔ لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں بے تابی سے چھلکے لیکن وہ ٹپ ٹپ اور بے جان ہی مسکراہٹ سے بولی۔ ”ہاں ہاں رضی بیٹا کیوں نہیں اس کی شادی سے متعلق ہیں نا؟“

وہ بھونچکے سے رہ گئے۔ قدرے برہمی سے انہوں نے سر جھکا۔ وہ سمجھے شاید سروش مذاق کر رہی ہے۔ اسی لئے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے۔ ”دیکھو سروش! میں قہقہے سنجیدہ ہوں۔“

”اور میں بھی۔“

”تمہیں معلوم ہے سب کچھ۔“ انہوں نے دکھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ سروش نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹوں پر اک ساختہ مسکراہٹ تھی جس کا خفیف سا اثر بھی اس کے چہرے پر کسی نقش پر نہیں تھا۔ اور شاید آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں وہ بار بار پلکیں جھپک رہی تھی۔

”ارے نہیں رہے دو۔“ انہوں نے بازو سے پکڑ کر اسے اپنے مقابل کھڑا کیا۔ ”کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے لڑکی؟“ انہوں نے اس کی ناک مروڑی۔ ”اپنے کپڑے دیکھو یہ بکھرے ہوئے ہال۔ شاید منہ بھی کئی روز سے نہیں دھویا ہیں نا۔“

سروش نے ان کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے تاثرات سے عاری چہرہ ایک جانب بھکا کر کہا۔ ”کیا میں بہت بری لگ رہی ہوں رضی بیٹا؟“

وہ بڑے لگاؤ سے اس کی جانب نکتے رہے۔ ”سروش تم مجھے کبھی بھی بری نہیں لگ سکتی ہو؟“ انہوں نے اتنی سچائی سے کہا۔ کہ سروش ایک لمحے کو ان کے بازو سے لگ گئی۔ کبھی کے رکے آنسو اس کے رخساروں پر بہنے لگے تھے۔ انہوں نے اس کے گلے سیاہ ہال سہلائے۔ ”ہے لڑکی چلو جلدی سے ڈھنگ کے کپڑے پہننا ہال وال سیٹو تو تمہیں کھالائیں۔“



رضی بیٹا کی کوششوں سے اسے اچھا گھر کرانے پر مل گیا تھا۔ اتنے عرصے بعد اپنے گھر میں سب کے ساتھ اسے اب بھی ٹوٹ کر یاد آئے۔ یونہی لگتا تھا۔ جیسے وہ کبھی گھٹے ہوئے ہیں۔ ابھی آ جائیں گے۔

صبح دو دروازے پر سے اخبار اٹھاتی۔ تو ایک نظر ڈال کر چیل پڑتی کہ ابو کو پڑھنا ہوگا۔ کھانا لگاتی تو ان کی پلیٹ بھی رکھ دیتی۔ آہستگی سے دروازہ کھلتا تو اسے انہی کی آہٹ محسوس ہوتی۔ وہ حیرت سے ان کی چیزوں کو ہاتھ لگا کر دیکھتی تھی۔

گھر میں اب وہ بیٹلی سی رونق نہیں رہی تھی۔ سب چپ چاپ اپنے معاملات میں لگے رہتے تھے۔ وہ بھی کام کاج سے آ کر خاموشی سے بستر پر لیٹ رہتی۔ یا امی سے باتیں کرتی۔ ان کا ہاتھ بناتی۔ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی۔ اس نے ابھی

”ارے سروش!“ انہوں نے بڑے لگاؤ سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”تم بہت بڑی ہو گئی ہو۔ اتنی بڑی بڑی باتیں سوچنے لگی ہو۔ لیکن دیکھو خود کو تھانا سمجھنا۔“ وہ اسے سمجھانے لگے۔ وہ ہونٹ چباتی ہوئی خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ وہ اسے تسلی دینے لگے۔ اس کی ڈھارس بندھانے لگے۔ اسے دنیا میں بیٹے اس کے بے رحم فیصلوں کو گوارا بنانے اس کے غموں کو ہنس کر جمیل لینے کا حوصلہ پیدا کرتے رہے۔ ان کی باتیں دل میں سے ہو کر گزر رہی تھیں۔ ان کا ہر لفظ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر اپنائیت کا احساس ہوتا تھا۔

انہوں نے کمرے میں ادھر ادھر نگاہ ڈالی اور ماحول کا جو جمیل پہنا دور کرنے کو گفتگو سے لہجے میں بولے۔ ”اف!“ کتنی چھوڑ ہو تم سروش کی بیٹی! ذرا اپنا کمرہ تو دیکھو نالائق کس قدر بے ترحیب ہو رہا ہے۔“

”مناہیت ہے آپ کی۔“ وہ بے دلی سے مسکرائی۔

”کب تک یہاں رہنے کا ارادہ ہے۔ اس کباڑ خانے میں۔“ انہوں نے

پوچھا۔

”بس سوچ رہی ہوں کہ کوئی گھر مل جائے تو امی اور سب کو ہمیں بالوں۔“

میں ان کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہوں۔“ اس کی آواز رندھ ہی گئی۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔ اب تمہیں ہوسٹل میں نہیں رہنا چاہئے۔ اچھا میں اپنے

کسی دوست سے کہہ دوں گا۔ تمہارے لئے کوئی گھر دیکھ لے۔“

”صبح۔ یہ تو بڑا احسان کریں گے آپ۔“

”اچھا کان تو نہیں کھنچوانے۔ احسان کی بیٹی!“ انہوں نے آنکھیں نکالیں۔

”ہائے اللہ انہیں۔“ وہ ہنس کر اٹھ گئی۔ ”رضی بیٹا جانے بنا لوں۔“

”ابھی تک میں نے بھی نہیں لی۔“

مرجھائی ہوئی خوشیوں کا عکس تھا۔ ہڈیوں کو اس کی آنسوؤں سے خالی آنکھوں اور ساختہ ہنسی سے پھیلتے ہوئے لبوں پر حسرت ہی برستی نظر آئی۔ وہ سر جھٹک کر روتی ہوئی بولی۔

”آئی آئی! کچھ مت کہو۔ کچھ مت کہو۔“

سروش اس کے قریب چلی آئی اور رندھے ہوئے گلے سے کہنے لگی۔ ”نازش دیکھ تو رونے کی تو میں بھی روؤں گی۔“

ہڈیوں نے ایک ہارڈھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اور اس کے آنچل سے اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی نہیں۔ نہیں۔ آئی۔ میں نہیں روتی۔ میں نہیں روتی۔



گھر کی ضرورتیں بڑی مشکل سے پوری ہو رہی تھیں۔ ایک سروش کی تنخواہ میں اتنے لوگوں کا گزارا خاصا دشوار تھا۔ ابو کے فنڈ وغیرہ کچھ تو ان کی آخری رسومات پر اٹھ گئے تھے۔ کچھ گھر وغیرہ تبدیل کرنے پر۔ اب تو گھر کا دار و مدار صرف سروش پر ہی تھا۔

ایسی کبھی حسرت سے ٹھٹھا سانس بھر کر کہتیں! ہمیں کیا علم تھا۔ کہ کبھی اتنے مجبور ہو جائیں گے۔ کہ بیٹی کی کمانی پر نظریں لگی رہیں گی۔ ہائے میری بیٹی۔ وہ بچپن ہی میں کر کہتی۔ ”تیرا دل دکھانے والوں کو دکھ ملے تو فرار نہ ملے۔“

سروش اک پچیسکی سی سسٹراہٹ کے ساتھ سوچتی۔ کہ اس منہ کی ماری ماں کا قرار میں کہاں سے لاؤں؟ جو میرے دل کی دھڑکنوں کو میرے چہرے سے پڑھ لیتی ہے۔ جسے میرے من کے دکھ۔ میرے ماتھے پر لکھے نظر آتے ہیں۔ جو میری محرومیوں کو میری ناکام آرزوؤں کو۔ میری تھنہ تھناؤں کو میری آنکھوں میں دیکھ لیتی ہے۔

وہ عامر کے انکار سے ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ اسے خود سے نفرت ہی محسوس

تک عامر کے خط کا تذکرہ گھر میں نہیں کیا تھا۔ وہ امی کو اور دیکھی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ انہیں ابھی پتہ نہ چلے۔ وہ یہ بات کسی مناسب وقت پر ان کے علم میں لانا چاہتی تھی۔ رضی بیوی کو نامعلوم کیسے پتہ چلا تھا اور نہ دوسرے رشتے داروں میں ابھی بات عام نہیں ہوئی تھی مگر اک شام وہ اگلے دن کیلئے پیکچر تیار کر رہی تھی۔ نازش بھی قریب ہی بیٹھی ٹولس بنا رہی تھی۔ ساتھ کے کمرے میں راجہ امی کے پاس بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ اچانک اس نے بلند آواز میں کہا۔ ”امی! یہ عامر الو کا پٹھا۔ میرے ہاتھ سے ہی ٹوٹ ہوگا۔“

سروش نے گھبرا کر نازش کی دیکھا۔ اور پٹھل ہونٹوں میں دبائے بڑے غور سے سن رہی تھی۔ امی کی دہلی ہی آواز سنائی دی۔ ”آہستہ بول لڑکے۔ تیری بہن سے کیا تو اسے رنج ہوگا۔ تقدیر پر کس کا زور ہے۔ جو متعذر دکھانے سہا پڑتا ہے۔“

راجہ ناموش نہیں ہوا اور نچانے کیا کچھ کہتا رہا۔ نازش نے سر اسید ہی ہو کر پھر سروش کی طرف دیکھا اس کی اس نگاہ میں کتنے ہی سوال تھے؟ ”آئی! یہ راجہ بھائی کیا کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ عامر نے شادی کرنی ہے۔“ سروش نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔ لیکن اس کے لفظوں میں گلگت کی آواز تھی۔

نازش ہونٹ کاٹ کر آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

”آئی! ہم کیا کریں؟ ابو بھی تو نہیں ہیں۔“

سروش نے جو بڑی کوشش سے منہ کے تھی ابو کے ذکر پر اس کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے چھلکے لگیں۔ اس نے جگت میں آنکھیں خشک کیں اور پچیسکی ہی ہنسی ہنس کر بولی یعنی اب تو ہم سب کو مل کر کام کرنا ہے۔ ابو جو کچھ چاہتے تھے جو خواب ہمارے دیکھتے تھے۔ انہیں پورا کرنا ہے۔ بڑی کوشش سے گلگت بنائے گئے لہجے میں اس کی

اس کا بہت خیال رکھتی تھی۔ اس کا دھیان ٹانے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ باہر نکلتی تو اس نے گاڑی صدف کے گھر کی طرف سوز دی۔ سروش کو خیال آیا کہ وہ بہت دنوں سے اس کو نہیں ملی تھی۔ حالانکہ وہ ایک آدمہ دفعہ اس کے یہاں آئی بھی تھی۔ ابو کے انتقال پر اس کی ڈھارس بندھانی رہی تھی۔ اس لئے آج اسے دیکھا تو بہت اچھا لگا۔ اس نے گرجوشی سے اسے گلے لگایا۔ اور روٹھی روٹھی سی بولی۔ ”سروش کتنی بے مروت ہیں آپ بھی ملنے کو یہی نہیں چاہتا۔“

سروش خوش دلی سے مسکرائی۔ ”چاہتا ہے تو آگئی ہوں نا؟“

”کی نہیں۔“ زیب نے غل دیا۔ ”آپ کو تو میں لاتی ہوں۔“

”ہوں۔“ صدف نے سر ہلایا۔ ”تو یہ بات تھی۔“

”نہیں یہ بات نہیں۔“ وہ بات ہے۔“ سروش نے مزاحیہ پن سے کہا تو دونوں ہنس پڑیں۔

دلچسپ باتوں کا سلسلہ چل لگا۔ زیب کے پاس تو ویسے بھی گفتگو کیلئے موضوعات کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اس بار ایک خاص جذبہ تھا کہ اس کا رومانس اک انٹینڈ ریٹرن کزن سے زوروں پر تھا۔ سروش نے اسے چھیڑا بھی ان سے یہ تو معلوم کر لینا تھا کہ مصوف کی زندگی میں اب تک کتنی سیمیں آچکی ہیں۔

ہاں بھی۔ انٹینڈ ریٹرن ہیں کوئی نہ کوئی کارنامہ تو کر کے آئے ہوں گے۔

ہونے لگی تھی۔ اسے اپنا آپ بڑا کم مایا محسوس ہوتا تھا۔ عامر اور اس کا بندھن زبردستی کا بندھن تو نہیں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو چاہا تھا۔ زندگی کا ساتھی چنا تھا۔ ایک دوسرے کو دل میں بسایا تھا۔ لیکن کیا وہ سب فریب تھا؟ کیا وہ محض ایک خوبصورت دھوکہ تھا؟ کیا اس جذبے میں صداقت نہیں تھی جو وہ اتنی آسانی سے دوسرے رنگ میں ڈھل گیا۔ اگر اس کا یہ تعلق بزرگوں نے طے کیا ہوا ہوتا۔ خود اس کی اپنی محبت اس کے اپنے دعوے اس کا اپنا اعتماد اس میں شامل نہ ہوتا بڑی آسانی سے بڑی سہولت سے بغیر ٹوٹنے بغیر بکھرے۔ اس جذباتی دھچکے کو برداشت کر جاتی۔ لیکن یہ تو اس کی محبت کی ہار تھی۔ اس کے جذبے کی توہین تھی۔ اس کی چاہتوں کی بارسائی تھی۔ وہ ایسا ہی بے برصغی سوچوں میں الجھی چائے پی رہی تھی۔ کہ زیب آگئی۔

وہ اکثر شام کو اس کے پاس آ جاتی تھی۔ اسے کہیں نہ کہیں ٹھہرانے لے جاتی

تھی۔ وہ اس کی بہت اچھی دوست تھی۔



جاؤ۔ میں شب تک صدف کا اہم دیکھتی ہوں۔“

”اوہو! ارے آدم بے زار یونہی بور ہوگی۔“ زیب نے کہا۔ صدف نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ لیکن سروش نے اٹھ کر شیفٹ میں سے صدف کا اہم اٹھالیا۔ صدف اس کے قریب آ کر بولی۔ ”اچھا سروش! بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔ نہیں ابھی جانا ہے۔ اس لئے۔“

”نہیں کوئی بات نہیں۔“ سروش نے نرمی سے کہا اور اس کا اہم دیکھنے لگی۔ زیادہ تر صدف کے سکول اور کالج کے زمانے کی تصاویر تھیں۔ کچھ تصاویر خاندانی تقریبات کی تھیں۔ اہل بیت پہلے صفے پر عاصم کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ سروش کی ہار اہم دیکھ چکی تھی۔ لیکن وہ دونوں ابھی تک نہیں لوٹیں تھیں۔ حالانکہ صدف چند منٹ کا کہہ کر گئی تھی۔ سروش کو معظوم تھا کہ زیب نے حسب عادت لمبی چوڑی گفتگو چھیڑ دی ہوگی۔ وہ بور ہو کر کھڑکی میں آن کھڑی ہوئی۔ یہاں سے باغ کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ خوش رنگ پھولوں سے ڈھکی کیا ریاں بہت خوبصورت لگے۔ وہ کھڑکی میں کھڑی دور کیا، ہوں پر منڈلاتی ہوئی تھیں کو دیکھتی رہی۔

اچانک سامنے کا پھولدار ریشمی پردہ ہٹا کر کسی نے بلند آواز میں کہا۔

”صدف! چابیاں نہیں مل رہی ہیں۔“

سروش نے محرم کرنگاہ اٹھائی۔ عاصم خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اوہ آپ ہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا اور اندر چلا آیا۔ سروش کچھ جھجک گئی۔ وہ بڑی بے تکلفی سے پوچھنے لگا کہ صدف کہاں ہے؟

”کوئی مہمان آئے تھے ان سے ملنے گئیں ہیں۔“ سروش نے میکانیکی انداز

میں اطلاع دی۔

”چلے ان کے آنے تک آپ ہمیں سے باتیں کیجئے۔“ وہ کھڑکی کے قریب

صدف نے نکتہ دیا۔

”جی نہیں وہ فرماتے ہیں کہ انہیں میموں سے پرہیز ہے۔“ زیب نے پکاسا منہ بنا کر کہا۔ تو صدف کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سروش بھی محظوظ ہوئی۔

ملازمہ چائے لے آئی۔ اور صدف کو بتایا کہ اس کے کوئی رشٹے دار آئے ہیں۔ وہ کچھ دیر کیلئے ان سے مل آئے۔ صدف معذرت کرتی ہوئی اٹھ گئی۔ زیب نے ملازمہ کو بھی چٹا کیا اور خود چائے بنانے لگی۔

سروش اٹھ کر منتظر نہیں گئی۔ جس پر صدف کی بڑی سی رنگین تصویر رکھی تھی۔ سروش نے تصویر اٹھا کر زیب کو دکھائی۔ اچھی ہے نا۔“

”ہاں۔“ اس نے ہنکارا بھرا۔ ”آؤ چائے پیو۔“ اس نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔

سروش نے پیالی لے لی۔ اور صدف کے کمرے کی پرکلف سجاوٹ دیکھ کر بولی۔ ان کا گھر بہت خوبصورت ہے۔ خاصا اچھا ذوق ہے ان کا۔“

”ارے ان کا کیا ہے۔ بے تحاشا پیسہ ہو تو ذوق اچھا ہو ہی جاتا ہے۔“ زیب نے بے نیازی سے جواب دیا۔

”نہیں بھئی۔“ سروش نے تردید کی۔ ”نفاست اک اور چیز ہے۔ زیب پھر کوئی ٹھنڈے چھوڑنے والی تھی کہ صدف کمرے میں آئی۔“ چلے جناب! راحت اکل بہت بے ترار ہو رہے ہیں لٹھے کو۔ آپ کے ڈیڈی کیلئے شاید کوئی پیغام بھی دینا ہے انہیں۔“

”ارے راحت اکل!“ زیب اچھل پڑی اور آدمی پیالی چائے ثنائی میں رکھتی ہوئی بولی۔ ”کیا حرسے کے آدمی ہیں سروش! آؤ چلو تم بھی۔“

”لو میں بھلا کیا کروں گی جا کر۔“ سروش نے اطمینان سے کہا۔ ”تم لوگ

کی تصویر کے پاس رکھ دیا۔

عامم دو ہی قدموں میں اس کے قریب آ گیا اور ہولے سے بولا۔ ”سروش“  
پھول آپ کیلئے ہے۔“

مجھے معلوم ہے۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

”معلوم ہے۔“ اس نے سر کو حیرت سے جنبش دی۔ ”اپنے پاس رکھ لیجئے نا۔“

”جی نہیں۔ یہ مرجھا جائے گا۔“ اس نے مضبوط لہجے میں کہا اور وہاں سے

بہت کڑالی تک آگئی اور اس کیلئے چائے بنانے لگی۔

وہ ابھی تک مشعل چیر کے قریب کھڑا پھول کو دیکھ رہا تھا۔ یوں جیسے کسی گہری

سوچ میں ہو۔ سروش نے بیانی اٹھا کر اسے مخاطب کیا۔ ”چائے لیجئے۔“

وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر اچانک بولا۔

”جی نہیں شکر یہ!“ اور کمرے سے نکل گیا۔



سروش میں نے بھی ایک ٹوشن لے لی ہے۔ راجہ نے کہا۔ جو ابھی ابھی کالج

سے آیا تھا اور باور چٹا خانے میں اس کے قریب ہی بیٹھا کھانا کھا رہا تھا۔

سروش نے تیزی چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آرام سے پڑھائی کرو تم

ان چکروں میں نہ پڑو۔

راجہ نے جواباً ہوں ہاں ہی کی۔ یوں جیسے ہل رہا ہو۔ سروش نے نوالہ منہ تک

لے جاتے ہوئے روک لیا۔ ”راجہ تیرا جیب خرچ کم ہے یا کوئی اور ضرورت ہے۔“

راجہ نے پانی کا گلاس فوراً منہ سے ہٹا لیا۔ ”میں اس گھر کا سب سے بڑا لڑکا

ہوں۔ میری بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں اللہ مجھے نظر بد سے بچائے۔“

چلا آیا۔

سروش نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”میں اتنی باتوںی نہیں ہوں۔“

”تو پھر آپ کتنی باتوںی ہیں؟“ وہ کھل کر مسکرایا۔

سروش خاموش ہی رہی تو وہ پھر بولا۔ ”ہاں بتائیے کتنی باتوںی ہیں آپ۔“

سروش اسے نظر انداز کر کے وہاں سے ہٹ گئی۔ وہ کھڑکی میں جھک گیا۔ اک لمحے بعد

پٹنا۔ اس کے ہاتھ میں ایک خوبصورت سا پھول تھا۔ جو اس نے کھڑکی کے ساتھ گئے

ہوئے پودوں میں سے ابھی ابھی توڑا تھا۔ اس نے بڑی خوبصورت نظروں سے سروش

کی طرف دیکھا اور پھول اس کی طرف بڑھایا۔ ”یہ آپ کیلئے ہے۔“

سروش نے دیکھا کہ وہ سرخ گلاب ہے۔ وہ غیر ارادی طور پر اک قدم پیچھے

ہٹ گئی۔ اسے اپنی ہتھیلی ہوتی ہتھیلیوں پہ رکھا وہ سرخ گلاب یاد آ گیا۔ جو عامر نے

بڑے پیار سے رکھا تھا۔

”آپ تو ڈر رہی ہیں۔ پھول ہی ہے کچھ اور نہیں۔“ وہ خوش دلی سے

مسکرایا۔ سروش نے عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ پھر بولا۔ ”لے لیجئے

نا۔“ پھول تھا سے ہوئے اس کا ہاتھ اور نزدیک آ گیا۔

سروش کانپ گئی۔ یہ عامم اسے پھول کیوں دے رہا تھا۔ اس کی نگاہیں کیا

کہہ رہی تھیں اس کی مسکراہٹ اتنا تانناک کیوں تھی۔ وہ الجھتی گئی۔ لیکن وہ اس بات کو

اپنے غیر معمولی رویے سے الٹو بھی اور اہم نہیں بنانا چاہتی تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے پھول

اس سے لے لیا۔ عامم نے ایک لمحے کو اس کا ہاتھ تھاما اور ٹیٹھے سے لہجے میں بولا۔

”نوازش۔“

سروش ہاتھ جھڑا کر پلٹ گئی۔ تو وہ بولا ”ایک بیانی چائے تو پلائیے۔“ لیکن

وہ کڑالی کی طرف نہیں گئی اور بے تامل قدم رکھتے مشعل چیر تک چلی گئی اور پھول صدف

سروش نے پیار سے کہا: ”دیکھو اطمینان سے پڑھائی کرو۔ تمہاری فرسے کلاس پوزیشن آنی چاہئے۔“

وہ ہنسا نہیں اور بڑی سنجیدگی سے بولا: ”بہر حال یہ نمونہ تو میں لے چکا ہوں۔ اب سب کچھ تم پر ہی تو فرض نہیں۔“ سروش ننگی سے کچھ کہنے ہی والی تھی کہ وہ مکتب سے باہر نکل گیا۔“

سروش برتن سمیٹ کر اندر آئی تو دیکھا نازش بیٹھی ہوئی پڑھ رہی ہے۔ اس سے پوچھا دو ایک ادھر ادھر کی باتیں ہونیں اور وہ کچھ دیر آرام کرنے کو بستر پر دراز ہوگئی۔ اسے خاموش اور تنہا دیکھ کر ان گنت پریشان کن سوچیں اس کی جانب بڑھنے لگیں۔

ان دو ڈیڑھ سالوں میں اس کی چھوٹی سی دنیا تہہ و بالا ہوگئی تھی۔ وہ پہلا سا خوش و غم ماحول خراب ہو کر رہ گیا تھا۔ اب وہ سنجیدہ سی ذمہ دار لڑکی تھی جسے نیکلوں سانس گھیرے تھے۔ وہ خوشحالی اور بے لگاری کا زمانہ نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ حاصر کا تو اب خیال بھی نہیں آتا تھا۔ غم روزگار میں اس طرح الجھ گئی تھی کہ محبتوں کے وہ زمانے دل کی وہ دیوانگی، خواب و خیال ہوگئی تھی۔ کبھی کبھی دل میں اک انہجانی سی سکک کا احساس ہوتا تھا۔ کاش حاصر نے انکار نہ کیا ہوتا تو اس کی محبت کا مان رہ جاتا۔ اس کی انا کا بھرم قائم رہتا۔ وہ زندگی بھر اس کا نام لے کر بیٹھی۔ اپنی حیات کے سارے خوبصورت لمحے اس کی یاد سے فروزاں کر لیتی۔ لیکن اب کیا باقی رہا تھا۔ کوئی آرزو تھی نہ کوئی دلولہ نہ کوئی خواہش تھی نہ تنہا۔ دل میں کوئی پھول نہیں کھتا۔ آنکھوں میں کوئی خواب نہیں بستا تھا جیسے اس نے کبھی اسے چاہا ہی نہیں تھا۔

اسی شام رضی بھیا بھی آئے۔ وہ اپنے ڈاکٹر دوست کی سفارش بن کر آئے تھے جس کی طرف سے سروش کیلئے پتہ چلا یا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ اس کا دماغ ٹھکانے

”صورت دیکھی ہے اپنی۔ نالائق نہ ہو تو ابھی تیری پڑھائی میں حرج ہوگا۔“

”پلیز مستثنیٰ وغیرہ نہ کریں۔“ وہ بولا۔

سروش کو ہنسی آگئی۔ ”آپ بھی ذرا اس گھر کے پاؤں جٹا چھوڑ دیں۔“

وہ کچھ نہیں بولا اور خاموشی سے کھانا کھاتا رہا پھر سر اٹھا کر بڑی سنجیدگی سے کہنے لگا۔ ”سروش۔ میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا کہ ہمارے لئے تم اپنا زندگی برباد کرو۔“

”کو مت۔“ سروش نے برا سانس بنا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”اپنے گھر میں اپنے لوگوں میں بھی کہیں زندگی برباد ہوا کرتی ہے۔“

”نہیں۔“ تم مجھے یہ بتاؤ۔ تم نے رضی بھیا کے دوست کیلئے انکار کیوں کیا ہے۔ اچھا خاصا معقول آدمی تھا وہ۔“

”تمہاری طرح۔ میں نا۔“ اس نے مذاق میں نالٹا چاہا۔ ”میں سنجیدہ ہوں۔“

وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

”اس عمر میں آپ پر سنجیدگی اچھی نہیں۔“ سروش نے اس پر مسہ چڑایا اور اٹھ کر برتن سمیٹنے لگی۔

”تم میری بات کو مذاق میں نہ ٹالا کرو۔“ وہ ننگی سے بولا۔ ”تم بھی کبھی کوئی عقل کی بات کر لیا کرو۔“ وہ ہاتھ دھوئے ہوئے بولی۔ اور پانی کا چھینٹا اس پر اچھال دیا۔

پانی کی پھوار سے دلچسپی آنکھیں بند ہو گئیں۔ وہ منہ صاف کرتا ہوا تین کے قریب آ گیا۔ سروش۔ اتنی بات ذہن میں رکھو کہ میں ڈرامائی اسے کر لوں۔ ”پھر تمہاری ایک نہیں سنی جائے گی۔“

”خیر ابھی تم اتنے بڑے نہیں ہوئے کہ ان باتوں میں دخل دو۔ سمجھے۔“

رضی بھیا بڑے لگاؤ سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کا اک اک لفظ ان کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔ انہوں نے محبت سے اس کا رخسار چھتھایا۔

”سروش! تم نے مجھے لاجواب کر دیا ہے۔“

صدف نے اپنی شادی پر اتنے اصرار سے بلایا تھا کہ وہ کوئی بہانہ بھی نہیں بنا سکتی تھی۔ وہ اس کے یہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ عامر کا سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی ذات میں اس کی دلچسپی کو پہچان گئی تھی۔ وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے سیکھ پر روک دینا چاہتی تھی۔ یہ زخمی لگا ہیں، یہ معنی خیز انداز، یہ پر محافی لہجہ۔ سب اس کے لیے بے معنی تھے۔ اب وہ کسی پر اعتبار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب وہ محبت جیسے مواد بننے والے جذبے کا شکار نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنے جذبوں کی تعمیر گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ وہ عامر کے سامنے اقرار کر لینے پر اب تک پہنچتی تھی۔ وہ اسے دل میں جگہ دے کر پشیمان ہوئی تھی۔ وہ اسے سن میں بسا کر اپنا مان توڑ بیٹھی تھی۔ اگر اس نے عامر کو نہ چاہا ہوتا اور وہ منگنی توڑ دیتا تو اسے دکھ تو ہوتا۔ لیکن وہ یوں اپنی ہی لگا ہوں میں حقیر نہ ہو جاتی۔ عامر نے کسی اور کا ہاندھا ہوا بندھن نہیں توڑا تھا۔ اس نے تو چاہت کی ریشمی ڈور کو توڑ دیا تھا۔ محبت کے پھولوں کو قدموں تلے روند ڈالا تھا۔

اس لمحے کا پچھادا سروش کی جان کے ساتھ ساتھ تھا وہ بار بار سوچتی کہ کاش اس نے عامر کو نہ چاہا ہوتا تو آج یوں پشیمان بھی نہ ہوتی۔ کاش عامر اس بات سے بے

لگانے آئے ہیں اور انہوں نے آتے ہی اس کے ساتھ بڑی زوردار بحث شروع کر دی تھی۔

سروش جب انہیں کسی طرح قائل نہ کر سکی تو سوچ میں پڑ گئی پھر سر اٹھا کر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

”رضی بھیا۔ اگر میں شادی کر لیتی ہوں تو اس گھر کا کیا ہوگا؟“

رضی بھیا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور متاثر کر دینے والے لہجے میں بولے۔

”سروش۔ کیا ہم لوگ تمہارے کچھ نہیں لگتے ہاؤ۔ تم ہمیں اپنا نہیں سمجھتیں۔؟“

سروش ان کے اپنایت بھرے لہجے سے متاثر ہوئی وہ اس کا ہاتھ تھامے تھے۔ تو اسے ڈھارس ہو گئی تھی۔ وہ خود کو پہلے سے زیادہ محفوظ اور مضبوط محسوس کر رہی تھی۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ بھی ان کے ہاتھ پر رکھ دیا اور منکر لہجے میں بولی۔ ”رضی بھیا۔ کیا یہ باتیں بھی کہنے کی ہوتی ہیں۔ رضی بھیا کیا آپ نہیں سمجھتے کہ میں آپ کی وجہ سے خود کو محفوظ خیال کرتی ہوں۔ آپ کے ہونے سے مجھے کتنی ڈھارس ہے کتنی تقویت ہے۔“



کر رہی تھیں۔ سب لوگ صدف اور اس کے دوہا کے ساتھ چلتے ہوئے ہال سے باہر نکل گئے۔ اور وہ ایک جانب اداسی کھڑی رہ گئی۔

وہ تو وداع کے اس انجانے لمحے کو ترستی رہ گئی تھی۔ یہ مسکراتا ہوا مغموم سالک کچھ کچھ کھو رہے اور بہت کچھ پالینے کا لمحہ ایک نئی اور رنگین زندگی کے آغاز کا لمحہ ہمیشہ کیلئے اس کی زندگی سے دور ہو گیا تھا۔ اس نے ہائل کا آنگن چھوڑ کر شرمیلے قدموں کے ساتھ اس کے ہمراہ ایک نئی زندگی کے آغاز کی تشنا کی تھی۔



”آپ کیا سوچ رہی ہیں؟“ کسی نے اسے مخاطب کیا۔ تو وہ چونک گئی۔ اس نے کھوئی ہوئی سی نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ سینے پر ہازہ لیٹے عاصم قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ جھجک رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھوں سے عمر میاں کی جھانک رہی تھی۔ اس کے کاہلی دوپٹے کا آچل فرش سے چھو رہا تھا۔

وہ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہولے سے اس کا زمین سے چھوٹا ہوا گلانی آچل تمام کمراس کے بازو پر ڈال دیا۔ وہ مسرت کر بیچھے ہٹ گئی۔

”صدف کی رخصتی نے آپ کو بہت اداس کر دیا“ وہ بولا۔

سروش نے بے دلی سے سوچا کہ میں کسی سے کیا کہوں کہ مجھے کس نے اداس کر دیا ہے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”صدق میری بہت پیاری بہن تھی، اس کے چلے جانے سے یہ گھر بڑا اور ایران ہو جائے گا۔“

سروش کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر کیا کہنا چاہیے۔ یونہی کچھ سوچ کر بولی۔ ”یہ لمحہ بڑا صبر آزما ہوتا ہے۔ اتنی وابستگیاں چھوڑنا ہزنی ہیں۔“

”لیکن اتنی وابستگیاں چھوڑ کر جو رفاقت حاصل ہوتی ہے، وہ اس کی سلامتی

خبر ہوتا کہ وہ بھی اسے جانتی ہے۔ اسے دل میں بسائے بیٹھی ہے تو وہ یوں ٹوٹ پھوٹ نہ جاتی۔ خود کو اتنا سبک نہ سمجھتی۔ وہ اپنا سامنا تو کر سکتی۔ وہ خود سے نگاہ تو ملا سکتی۔ وہ بار بار اس اذیت سے نہیں گزرنا چاہتی تھی وہ پھر گھائل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اب کسی کمزور لمحے سے ہارنا نہیں چاہتی تھی۔

لیکن صدف کی شادی میں تو اسے جانا ہی تھا۔ وہ یونہی بے دلی سے تیار ہوئی۔ سادگی سے ہال بنائے اور کوئی زیور نہیں پہنا۔ لیکن تیز گلانی سوت اور کاہلی دوپٹے میں وہ بڑی کھلی کھلی سی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سادگی میں اک حسن تھا۔ اس کے وجود پر چھائی ہوئی افسردگی متوجہ کرتی تھی۔ اس کا اداس چہرہ گہماگہما اور چہل چہل میں اٹھانا سا لگتا تھا۔

شادی کے پہلے سوانہ کے درمیان بیٹھی ہوئی وہ بے حد یور ہو رہی تھی۔ اس کی شخصیت اتنی دلچسپ نہیں تھی کہ کوئی اس کا ساتھ دیتا۔ اس کی طرف متوجہ ہوتا۔ صدف دلہن بن رہی تھی۔ زیب دوسری لڑکیوں میں کھل مل گئی تھی۔ اور سروش اتنے جھوم اور رونق میں پھر تیار رہ گئی تھی۔ یوں جیسے سنانے کے تصور میں گھر گئی ہوئی۔

اس کی اُلجھی ہوئی سوچوں نے اسے ہیکل کر دیا تھا۔ یہ کیسی سوچیں تھیں جو اس کا بیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ یہ کیسے تصورات تھے جو ہر لمحہ اس پر یلغار کیے دیتے تھے۔ یہ کیسی یادیں تھیں جو بھلائے نہیں بھولتی تھیں۔

گھونٹ میں سے بھٹکتا ہوا صدف کا گلاب سا چہرہ دیکھ کر وہ لمحہ بار بار اس کی نگاہوں میں بھٹکتا تھا۔ جس نے اسے دلہن کے روپ میں دیکھا تھا۔

اس نے سر جھٹک کر پراگندہ خیالات سے بیچھا چھڑانا چاہا اور وداع کے گیت سننے لگی۔ صدف رخصت ہو رہی تھی۔ لڑکیاں ہر طرف سے جھوم کے دیتی تھیں۔ فونو گرافز اپنا کیمرو سنبھالتا یہاں وہاں لڑھکتا بھر رہا تھا۔ بڑی بوڑھیاں اداسی سے آنکھیں خشک

سروش! نظر انداز کر گئی۔ اور یونہی گھڑی دیکھ کر بولی۔ ”مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔“

”چلئے آپ کو گھر پہنچادیں۔“ وہ ڈراما سا خم ہوا۔

”جی نہیں شہریا“ سروش نے غلٹ میں جواب دیا۔ ”مجھے زیب ڈراما کرے گی۔“

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا اور وہ آگے بڑھ آئی۔ لیکن زیب نہ جانے کہاں رو گئی تھی۔ نہ ہی چکاچوند روشنیوں اور گاڑیوں کے ہجوم میں اس کی گاڑی کہیں نظر آتی تھی۔ سروش بے حد پریشان ہوئی۔ وہ اتنی رات گئے تھا جیسی میں نہیں جا سکتی تھی۔ اسے کھڑے کھڑے کافی دیر ہو گئی تھی۔ دوسرے مہمان گاڑیوں میں بیٹھ بیٹھ کر جا رہے تھے۔ اور وہ وہاں اکیلی گھڑی خود کو بہت کم مایہ سانسوں کر رہی تھی کہ پھر کوئی اس کے مقابل آن نہ رکا۔ سروش نے چونک کر دیکھا۔ عام مسکرایا۔

”زیب صاحبہ! جا چکی ہیں۔ میں نے ان کو یقین دلایا تھا کہ آپ کو دوسری گاڑی میں بھجوا دیا گیا ہے۔“

سروش ہکا بکا رہ گئی۔ ”مگر کیوں؟“

”آپ چلئے میرے ساتھ۔ میں اس“ کیوں“ کی وضاحت کرو دیتا ہوں۔“ وہ بڑے اطمینان سے بولا۔

سروش زچ ہی ہو گئی۔ ”کیا مطلب ہے آپ کا؟“

”سروش! یقین کیجئے۔ کوئی ایسا مطلب نہیں ہے۔ جو آپ کو ناگوار گزارے۔“ وہ ملاحت سے کہنے لگا۔ ”تو پھر؟“

”تو پھر یہ کہ کچھ ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں۔ جو ہجوم اور افترا تفری میں نہیں کہی جاتیں۔ انہیں کہتے اور سمجھتے کیلئے سکون کی ضرورت ہوتی ہے۔“ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا۔

کر جتی ہے۔“ عام نے بڑی خوبصورت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ اس کی نگاہوں کا مفہوم سمجھ کر قدرے سختی سے بولی۔ ”یہ ضروری تو نہیں بعض اوقات تو یہ رفاقت جان کا آزار بن جاتی ہے اور لڑکی بے چاری دوسروں کے قول بھائی رہتی ہے۔“ وہ جان بوجھ کر اس کے خوبصورت خیالات برہم کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے تلخ پہلو کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔

”آپ تو مجھے وہیں لبریشن فرنٹ کی نمائندہ معلوم ہو رہی ہیں۔“ وہ بولا

”ہر لڑکی اس کا نمائندہ بنا چاہتی ہے یہ اور بات کہ مجبوریاں اسے باندھ لیں۔“ سروش نے اسے الجھایا وہ منگٹو میں تنگی اور رکھائی برقرار رکھنا چاہتی تھی تاکہ ماحول کچھ کہہ دینے، کچھ سمجھانے کیلئے سازگار نہ ہو جائے۔

”آپ اس موضوع پر بڑی اچھی بحث کر سکتی ہیں۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔ ”یہ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ خواتین کا محبوب موضوع ہے۔“

سروش نے اس کی شوخ نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا اور اسی لمحے میں بولی۔ ”اور ہمارے یہاں تعلیم یافتہ مردوں کا محبوب مشغلہ خواتین کے مسائل سمجھے بغیر ان کا مذاق اڑاتا ہے۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”میرا خیال تھا کہ آپ یہاں استحصال کا غلط استعمال کریں گی۔ وہ زیادہ موزوں تھا اور مقبول بھی۔“

سروش اس کے مذاق اڑانے پر کچھ چڑھی۔ سختی سے بولی۔ ”آپ اور سارے مرد یہی سمجھتے ہیں کہ عورت کو کچھ بھی نہیں کہنا چاہیے۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ خواتین کو تو بہت کچھ کہنا چاہیے۔“ عام نے مسکراتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے کہا۔ ”ہم تو فطرت ہیں کہ خواتین بھی تو کچھ کہیں۔“ اس کی مسکراہٹ بڑی بلیغ تھی۔

لا تعلق ہو۔

”سروش امیری بات کا جواب دیتے۔“ وہ گھمبیر سے لہجہ میں بولا۔

”میں آپ کی بات کا جواب۔“ بات اس کے منہ میں ہی رہی۔ کہ اچانک سامنے آ جانے والی موٹر سائیکل کو بچانے کیلئے عاصم نے زور سے بریک لگائے۔ گاڑی تیز آواز کے ساتھ ایک جھٹکے سے زکی۔ سروش بے خیالی میں بیٹھی تھی۔ اس کا سر زور سے ڈیش بورڈ کے ساتھ ٹکرایا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے تارے اٹھے۔ ایک سکاری سی لنگر اس نے خود کو سنبھالا۔ لیکن سر پکرا رہا تھا۔

عاصم نے گاڑی ایک جانب روکی اور اس کی جانب متوجہ ہوا۔ سروش پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے لائٹ جلائی۔ ”آپ ٹھیک تو ہیں؟“

”ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے خود کو مارل رکھنے کی سعی کی۔

”نہیں۔ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔“ وہ اس کا ہاتھ اس کی پیشانی سے پیچھے سے ہٹاتا ہوا بولا۔ ”دیکھئے دیتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے ہاں۔ آپ گھر چلئے۔“ سروش نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

عاصم نے جیب سے رومال نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ آپ کو چوٹ لگی ہے۔ یہ رومال رکھیے پیشانی پر۔“

”کچھ نہیں ہوا۔“ سروش نے چڑچڑے پن سے کہا۔ ”ایسے ہی بات نہ بڑھائیے۔“

عاصم نے رومال ڈیش بورڈ پر رکھ دیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ وہ آگے بڑھا تو اس کی رفتار غیر معمولی طور پر تیز تھی اور وہ ایک دوسری سڑک کی جانب مڑ گیا۔ جو اس کے گھر کی طرف نہیں جاتی تھی۔

”یہ کہاں جا رہے ہیں آپ؟“ سروش نے پریشانی سے پوچھا۔

سروش نے گوگو کی کیفیت میں الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔

”آئیے۔“ اس نے پورے آداب کے ساتھ گاڑی کی طرف اشارہ کیا اور

بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سروش کچھ سوچتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔

”توازش!“ وہ دوسری جانب سے بیٹھے ہوئے بولا۔

سروش ان سنی کر کے شیشے سے باہر دیکھتی رہی۔ اس نے گاڑی گیٹ سے باہر

نکالی۔ کچھ دیر خاموشی سے چلا تا رہا۔ سروش بھی چپ بیٹھی رہی۔ گاڑی میں تیرتی ہوئی۔

خاموشی نہ جانے کیا کہتی رہی۔ پھر عاصم نے اسے مخاطب کیا۔ ”سروش! میں نے کوشش

کی تھی کہ آپ کو نظر انداز کر سکوں۔ آپ نے جو پھول مرجمانے کی بات کی تھی۔ اسے

تسلیم کر لوں۔ لیکن ایسا ممکن نہیں ہو سکا۔ میرا دل بار بار کہتا ہے کہ آپ سے پوچھوں تو

سہی۔ کہ آپ نے وہ پھول قبول کیوں نہیں کیا تھا۔ پھول مرجمانے تو بھی۔ ان کی

خوشبو نہیں مرجمانی۔ بیٹھے باقی رہتی ہے۔ دل کی دنیا میں، روح کی گہرائیوں میں۔“ وہ

پڑتا شیر لہجے میں کہتا رہا اور سروش کے دل کی دھڑکنوں میں اس کے لفظوں کی گونج سنائی

دیتی رہی۔

اس نے پریشانی سے سر جھٹکا۔ وہ کیوں اس کی زندگی میں لیبل ہی بچا رہا تھا۔

جس باب کو وہ ہمیشہ کیلئے ختم کر چکی تھی۔ وہ اس کو کھولنا چاہتا تھا۔ وہ دل میں ننھی منی سی

کلیوں کی مانند چمکتی ہوئی تیناؤں کو نظر انداز کر کے یوں بیٹھی رہی۔ جیسے اس سے بالکل

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی چلاتا رہا۔ بہت تیزی کے ساتھ۔ سروش اور پریشان ہوئی۔ "تاتے کیوں نہیں آپ۔ کدھر جا رہے ہیں؟ گھر کیوں نہیں چلتے؟"

وہ یوں بیٹھا رہا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے گاڑی ایک گھر کے گیٹ پر روکی۔ جس کے باہر ڈاکٹر عادل حمید کا پورڈا لگا ہوا تھا۔ اس کے ہارن دینے پر گیٹ کھلا اور وہ اندر داخل ہوا۔

"عادل ہے۔" اس نے ملازم سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" وہ بولا۔

"آئیے۔" عاصم نے دروازہ کھول کر کہا۔

سروش نے غصے سے ہونٹ بھینچے۔ "کیا ضرورت تھی آپ کو آنے کی۔"

"ضرورت یہ تھی کہ آپ کو یہ چوٹ پھری وجہ سے لگی ہے۔ اور اب اس

چوٹ کا علاج بھی میں ہی کروں گا۔" اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔

سروش بڑی پس و پیش سے باہر نکلی۔ ملازم نے دروازہ کھولا اور وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے اور دوسرے دروازے سے ایک خوش فکل سارٹ سا شخص اندر آیا۔ انہیں دیکھ کر وہ ٹھنکا۔ "عاصم! پارٹنریت تو ہے۔ تم اس وقت۔ ابھی تو میں تمہاری طرف سے آیا ہوں۔"

"ہاں پارٹنریت تو ہے۔ مگر تھوڑی ہی کم ہے۔" عاصم نے کہا۔

میں تو دیکھ رہا ہوں کہ خیریت بہت زیادہ ہے۔" اس نے سروش کی طرف

دیکھ کر سلام کیا۔

"یہ مس سروش! ہیں۔ صدف کی دوست۔ انہیں چوٹ لگ گئی ہے۔ سوچا

تھیں دکھالوں۔"

"واہ..... واہ۔ آپ کی سوچ تو بہت ہی اچھی ہے۔ یہ تو آپ نے بہت نیکی

کا کام کیا ہے۔ ماشاء اللہ! جزاک اللہ!" وہ مزاحیہ انداز میں کہتے ہوئے۔ سروش کے قریب آیا۔

"مس سروش! اس بندے سے بچ کر رہیے گا۔ یہ بڑی گہری چوٹ لگا ہے۔"

سروش سنجیدہ ہی رہی۔ وہ دل میں سچ و تاب کھا رہی تھی۔ ڈاکٹر عادل کا شریر انداز اسے پریشان کر رہا تھا۔ وہ اس کی کسی بات کا جواب دے کر اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر عادل نے اس کی چوٹ دیکھی۔ ملازم سے میزیکل باکس منگوا کر ڈرینگ کردی اور بولا۔ "مس سروش! اب تو مسکرا دیجئے۔ چوٹ کچھ اتنی زیادہ خطرناک بھی نہیں کہ آپ یوں مذہبوسرے رکھیں۔"

اس کے بے ساختہ انداز پر سروش نے اپنی مسکراہٹ بمشکل ضبط کی اور عاصم کی طرف دیکھ کر بولی۔ "چلتے بچھے دیر ہو رہی ہے۔"

"دیر ہو یا سویر۔ آپ نہیں جا سکتیں۔" ڈاکٹر نے اعلان کیا۔

سروش نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "یہ تا بھارتو ہمارے ہی ٹکڑوں پر پلتا ہے۔ لیکن آپ پہلی مرتبہ میرے گھر آئی ہیں۔ آپ چائے پیئے بغیر نہیں جا سکتیں۔"

"جی نہیں شکر یہ!" سروش نے کہنا چاہا۔

"جی شکر یہ! بالکل نہیں۔ کیونکہ ابھی تو آپ نے چائے پی ہی نہیں۔" ڈاکٹر

عادل نے کہا اور اسی وقت ملازم چائے کی ٹرائی لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔

"لیجئے جناب چائے بھی آگئی۔" اس نے آگے بڑھ کر ٹرائی تھامی اور سروش

سے بولا۔ "چائے پیئے میں تو آپ کو تھوڑی سی دیر لگے گی اور مجھ غریب کا دل ٹوٹنے

سے بچ جائے۔ کچھ رقم کیجئے میرے حال پر بھی۔"

وہ کچھ کہہ سکتی تھی اور نہ چپ رہ سکتی تھی۔ بے چینی سے پہلو بدل کر وہ بات کو نظر انداز کر کے بولی۔ ”جلدی چلے۔ مجھے دیر ہو رہی ہے۔ امی لکر کر رہی ہوں گی۔“

”میری بات کا تو آپ نے جواب ہی نہیں دیا۔“ اس نے مسکراتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

سرروش خاموش ہی رہی۔ وہ کچھ کہہ کر بات بڑھاتا نہیں چاہتی تھی۔ وہ رخ پھیر کر شیشے سے باہر نکلے گی۔ عاصم بھی کچھ دیر خاموش رہا۔ اور خاموشی کا یہ وقفہ لمبہ لمبہ طویل ہونے لگا۔ اور سرروش کا گھر قریب آنے لگا۔

سرروش نے اطمینان کا سانس لیا۔

عاصم نے گاڑی روکی۔ سرروش نے دروازہ کھولتے کیلئے پنڈل پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ پلٹ کر بولا۔ ”مس سرروش!“

سرروش نے پلٹ کر دیکھا۔ تو وہ ہنس کر بولا۔ ”میرے سوال کا جواب آپ کے ذمہ ہے۔“

سرروش نے کوئی جواب نہیں دیا اور گاڑی سے باہر نکل آئی۔



لیکن اگلے تمام دن یہ بات اس کے ذہن سے نہیں نکلی۔ اس کی آواز، اس کی یہ بات، اس کا لب و لہجہ اور اس کی نگاہ کا زاویہ سب اسے بار بار چھیڑتے رہے۔ اس کی پیشانی پر لگا ہوا بیٹنجا اسے ڈاکٹر عادل کی شریر باتوں کی یاد دلاتا رہا۔ نہ جانے کیوں وہ یہ سب باتیں نظر انداز کیوں نہیں کر پاری تھی۔ انہیں بھول جانے کی خواہش کے باوجود وہ انہیں بھول نہیں پاری تھی اور عاصم بار بار دل کے آئینے میں اپنی سبب دکھلانے لگا تھا۔



وہ اتنی سادگی سے یہ سب کہہ رہا تھا کہ سرروش کو بیٹھنا ہی پڑا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ عاصم مضطرب سا تھا اور بار بار اس کی جانب دیکھتا تھا کہ کہیں اس کا موڑ تو خراب نہیں ہو رہا۔ کیونکہ ڈاکٹر عادل کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ وہ بے ضرر مزاجیہ انداز میں خوب ادھر ادھر کی باتیں کہہ رہا تھا۔

خدا خدا کر کے چائے ختم ہوئی۔ تو وہ جلدی سے اٹھی۔ ڈاکٹر عادل انہیں باہر تک چھوڑنے آیا۔ وہ گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ تو اس نے عاصم سے گویا رازداری سے کہا۔ ”بس پارا اب دیر نہ کرنا۔“

جیسے سرروش نے صاف بتا۔ وہ اس کا مطلب خوب سمجھ رہی تھی اور دل ہی دل میں بری طرح سے اُلجھ رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ یہاں کیوں چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر عادل نے اس کی جانب آ کر شیشے میں سے جھانکا۔

”مس سرروش! امید ہے اب جلد جلد ملاقات ہوتی رہے گی۔ آپ نے تو ہمارا دل سوہ لیا ہے۔“

عاصم نے گاڑی گیٹ سے نکالی۔ تو سرروش جو اتنی دیر سے صبا کیے بیٹھی تھی اس پر برس پڑی۔ ”کیا ضرورت تھی آپ کو یہاں آنے کی؟ وہ شخص نہ جانے کیا سمجھ رہا تھا۔ وہ..... وہ.....!!“

”آپ کو میری وجہ سے چوٹ لگی تھی۔ اس لیے میرا فرض تھا۔ اس کی ذرینک وغیرہ کرواتا۔ اور وہ شخص میرا بہت اچھا دوست ہے۔ شریف آدمی ہے۔ وہ کوئی ایسی بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ جو آپ کے شایان شان نہ ہو یقین رکھیے۔“ ا وہ بڑے سکون سے کہنے لگا۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد بولا۔ ”ویسے آپ کا کیا خیال ہے کہ وہ کیا سمجھ رہا تھا جو آپ کو قابل اعتراض لگا ہے۔“

سرروش جڑبڑ ہوئی۔ عاصم نے اسے ایک مشکل صورتحال میں ڈال دیا تھا۔ نہ

”فرمائیے۔“ سٹلے ہوئے پھولدار کپڑوں اور قدرے اُلٹھے ہوئے ہالوں میں وہ بڑی سادہ اور گھریلو معلوم ہو رہی تھی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ بے تکلفی سے پوچھنے لگا۔

”ٹھیک ہوں جی بالکل۔“ اس نے بڑے تکلف سے جواب دیا۔ اک عجیب سا احساس مرغوبیت اس پر چھایا جاتا تھا۔ وہ پریشان سی ہو کر سوچ رہی تھی کاش یہ یہاں نہ آیا ہوتا۔

”مجھے ایک ضروری کام سے باہر جانا پڑا۔ ورنہ میں پہلے ہی آپ کی مزاج پرسی کے لیے آتا۔ عادل بھی پوچھ رہے تھے۔ آپ کا زخم تو اب ٹھیک ہے نا۔“ وہ بڑی اپناہیت سے استفسار کر رہا تھا۔

”کوئی ایسی بڑی چوٹ تو نہیں تھی۔ شاید دوسرے تیسرے دن ٹھیک ہو گئی تھی۔“ سردش نے لاطعلق سے کہا۔ ”ویسے آپ کے اس تردد کے لیے شکریہ ادا“ اس نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”شاید آپ کو میرا آنا اچھا نہیں لگا۔“

سردش نے کچھ جھینپ سی تھی۔ وہ اس کی مزاج پرسی کو آیا تھا۔ جیسا بھی تھا۔ اس کا مہمان تھا۔ اس سے اتنی روکھائی کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یونہی خیف سی ہو کر بولی ”نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ تسلسل سے بولا۔ ”تو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

سردش نے یونہی سر کو جنبش دی۔ وہ صوفے سے اٹھا اور کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ سردش کچھ حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی یہ معنی خیز خاموشی بڑی مہربان تھی۔ چپ کے اس دھتے نے اسے بے کل سا کر دیا۔ اس کا یہ رویہ ناقابل فہم سا

وہ بھی عامر کی طرح اس کے دل میں اٹوٹھی تنہائیں چکانے لگا تھا۔ لیکن وہ اتنی نادان نہیں تھی کہ سب کچھ اتنی جلدی بھول جائے۔ ایک دفعہ غلطی کر کے پھر اس کا ارتکاب کرے۔ بار بار دھوکہ کھائے۔ بار بار اہتیار کرے۔

چوٹ ٹھیک ہو گئی تھی۔ مگر ہلکا سا نشان باقی تھا۔ آئینے میں اس نشان پر بار بار نگاہ پڑتی تھی۔ تو یادوں کا ایک رنگین دروازہ کھل جاتا تھا۔

یوں ہی پانی بہاتے ہوئے وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ جھٹو بھاگتا ہوا آیا۔ اور اسے جلدی جلدی تانے لگا۔ کہ ایسی ہی گاڑی میں کوئی مہمان اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ سردش نے گھبرا کر کہا۔ ”ان سے کہہ دو۔ کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ کہیں گئی ہوئی ہوں۔“ اسے جیسے معلوم ہو گیا تھا کہ ایسی ہی گاڑی پر کون آ سکتا ہے۔

”آئی اب تو میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ ہیں۔ وہ امد ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ جھٹو نے بے نیازی سے جواب دیا۔

تو وہ تذبذب سی ہو گئی۔ اسے یقین تھا کہ وہ عامر کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ جھٹلا کر وہ نامعلوم کیا کچھ بڑ بڑاتی ہوئی مجبوراً ڈرائنگ روم کی طرف چلی۔ لیکن دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس پر نامعلوم سی گھبراہٹ خاری ہونے لگی تھی۔

عامر اسے دیکھ کر احتراماً کھڑا ہو گیا۔ سردش نے اس کے آداب کا جواب دیا۔ لیکن کسی طرحوشی یا تھاک کا اعہار نہیں کیا۔ اور سپاٹ سے لہجہ میں بولی۔

دکھی سے اس کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو۔ وہ کچھ حیرانی، بے یقینی اور اضطراب کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ یہ سب کیا کہہ رہا ہے۔ اس کی آواز اسے بہت دور سے لیکن اپنے اندر سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہلکے جھپکے بنا اس کی جانب یوں حیرت سے دیکھ رہی تھی جیسے وہ کسی ایسی زبان میں بات کر رہا ہو جیسے وہ سمجھنے سے قاصر ہے۔

”سروش آپ میری بات سمجھ رہی ہیں نا۔“ عام نے ہونے سے کہا اور اس کا ہاتھ نرمی سے قمام لیا اسے یوں محسوس ہوا جیسے قضا میں اچانک موسیقی بکھر گئی ہے۔ اس کی دراز پلکیں اس کے رخساروں سے چھوٹنے لگیں۔ اس نے جھک کر اس کا دوسرا ہاتھ بھی قمام لیا اور لطف سی سرگوشی کی۔

”سروش کتنا اچھا ہو۔ اگر ہم ہمیشہ ایک ساتھ رہیں۔“

سروش کے لرزتے ہوئے ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھوں میں تھے۔ وہ اسے محبت کی انجانی راہوں پر لیے جاتا تھا۔ وہ اس لمحے کو بے بس کی ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ اس کے فراخ سینے پر سر رکھ کر ہمیشہ کیلئے آسودہ ہو جائے۔

اس نے پلکیں اٹھائیں اس کی شریلی نگاہیں ان محبت پاش نظروں سے ملیں جو اسے خوبصورت پیام دے رہی تھیں۔ اس کے گرد و پیش جھیلنا ہوا لہو بھول کی طرح کھل اٹھا۔

لیکن یہ بھول ایسا لہو کا نئے کی طرح اس کے من میں کھل گیا۔ کبھی عام نے بھی تو اس کے ہاتھ یونہی قمامے تھے۔ اسی طرح اس پر جھک کر کہا تھا۔

ہوتا جا رہا تھا۔ اچانک وہ اس کی جانب مڑ کر اس سے مخاطب ہوا۔ ”میں سروش! آپ نے تو تعذبات پر مبنی ہے۔ مجھے اک بات تو بتائیے۔ سنا ہے انسان جس سے بیزاری ظاہر کرتا ہے یا جس سے شعوری طور پر کتراتا ہے وہی اس کے نفس میں مغلوب نہیں ہوتا۔ آپ کی کیا رائے ہے۔ اس بارے میں۔“

سروش سن ہی ہو گئی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں اس کے مفہوم کو گہرا کر رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں سمجھا رہی تھیں کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ وہ اس حیران کن صورتحال کا مقابلہ کرنے کیلئے خود کو تیار کرنے لگی۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے۔ لیکن وہ اسے اس کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اس لیے اس نے مرعوب ہوئے بغیر عام سے لہجے میں کہا۔

اپنی اپنی رائے ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر کتابی بات سے متفق ہوا جائے۔“  
”تو گویا آپ اس سے متفق نہیں ہیں۔“ اس نے استفسار کیا۔

”میں رائے زنی نہیں کرتا چاہتی۔“ اس نے ناگواری سے جواب دیا۔  
وہ بے ساختہ فہم دیا۔ ”سروش آپ کا رویہ بڑا واضح ہے۔ آپ کی یہ لائق یہ بلاوجہ روکھائی اور بیزاری۔ یوں لگتا ہے ہے۔ جیسے آپ مجھے نظر انداز نہیں کر پائیں۔“  
سروش نے ہلکے ہلکے ہنسنے کی طرف دیکھا۔ وہ تھوڑا قریب آ گیا۔  
”سروش“ آپ جو رویہ میرے ساتھ روا رکھتی ہیں اس میں بناوٹ صاف نظر آتی ہے۔ یہ سب کچھ آپ کی شعوری کوشش معلوم ہوتی ہے۔

سروش کو اس سے اتنی صاف گوئی کی توقع نہیں تھی۔ وہ تو ہر لمحے خود کو یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ اس کے لیے ٹوٹی اہمیت نہیں رکھتا لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں آنکھیں اٹال کر اس نے یہ کیا کہہ دیا تھا کہ اس میں تردید کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔ وہ بڑی

”اس لیے کہ نفرت ہے مجھے آپ سے۔ زہر لگتے ہیں آپ مجھے۔ آپ چلے جائیں یہاں سے۔ تشریف لے جائیں میں کہہ رہی ہوں۔“

عاصم نے سختی سے اس کی کھائی پکڑ لی۔ ”جھوٹ بول رہی ہیں آپ۔“ اس کے لہجے میں بہت زور تھا۔

”نہیں! سروش نے اتنی ہی عمدگی سے اس کا ہاتھ جھکا لیکن عاصم کی گرفت مضبوط تھی۔ اس نے پھر ہاتھ چھڑانا چاہا لیکن اس نے نہیں چھوڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔“ جھوٹ کہہ رہی ہیں آپ۔ سروش مان جائے کہ یہ جھوٹ ہے۔ خلد ہے۔“

سروش نے خود کو کمزور پڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اسے معلوم ہوا کہ اگر وہ چند لمبے یہاں اور ٹھہرا۔ تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ وہ اپنی بات رکھنا چاہتی تھی۔ وہ اس کا مان توڑنا چاہتی تھی۔ وہ جو ہر مرد کی طرح سمجھ رہا تھا کہ وہ کمزور سی لڑکی۔ اس کی محبت پاش نظروں سے پھیل جائے گی۔ اس نے جھاکر اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”چھوڑیے۔ میرا ہاتھ۔“

عاصم نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ اور اسے کھینچ کر خود سے قریب کر لیا۔ اور اس کی گھٹے میں دیکھی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔

”ہاتھ چھوڑنے کیلئے نہیں پکڑے جاتے۔“

اس کی آواز کی گونج چاروں جانب پھیل گئی۔ وہ کانپ کر اس سے دور ہنسی ہوئی بولی۔ ”شرم آتی چاہیے آپ کو۔“

عاصم نے پیک لخت اسے ایک جھٹکے سے چھوڑ دیا۔ وہ لڑکھڑا کر قریبی صوفے پر گر پڑی۔ اور کچھ سم کر اس کی جانب نکلے گی۔ وہ کچھ دیر اس کی طرف تیز تیز نظروں

”مجھے میری سروش چاہیے۔“

یہ محبت کا چہرہ بدلا ہوا کیوں ہے؟ اس نے حیرت سے سوچا گل اس نے اسے عامر کے روپ میں دیکھا تھا۔ آج وہ عاصم کے پیکر میں مجسم ہو گئی تھی۔ اس نے گل دھو کر کھایا تھا۔ لیکن آج فریب کیوں کھائے؟ اس نے گولمگولی کی کیفیت میں سوچا۔

جذبات کی یورش جس نے اسے چھوٹی موٹی سا بنا دیا تھا ایک لخت زائل ہو گئی۔ وہ صرف اک عورت بن گئی۔ ایک فریب خوردہ عورت جس کا اعتبار محبت سے اٹھ گیا تھا۔ جسے محبت صرف ایک خوبصورت دھوکہ معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے زور سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور تکی سے بولی۔

”میں فضول باتیں سننے کی عادی نہیں ہوں۔“

اک لمبے کو تو عاصم بھونچکا سا رہ گیا۔ اس نے ابھی ابھی تو سروش کو شرمیلی دو شیزہ کے روپ میں دیکھا تھا جس کے شفق آلود رخساروں پر سیاہ پلکیں جھٹک جھٹک جاتی تھیں۔ اس کا سریوں جھکا ہوا تھا جیسے ابھی اس کے سینے سے آگے گا لیکن اب وہ آنکھوں میں برہمی کی چمک لیے اس کی جانب بے باکی سے دیکھ رہی تھی۔ وہ اس اچانک تبدیلی پر حیران تو ہوا لیکن سنبھل کر بولا۔

”سروش! آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“

”نہیں کہہ رہی ہو۔ آپ تشریف لے جائیے یہاں سے۔“

اس نے برہمی سے کہا۔

وہ کچھ دیر غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر تھکانہ سے لہجے میں بولا۔

”کیوں؟“

سوناہل کی گھنٹی بجی۔

نازش فون پر تھی۔ اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ وہ ہسپتال سے بول رہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ رلیج کا ایکٹیوٹ ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ برے برے سے خیالات نے اسے چکرا دیا۔ بار بار یہی خیال دل میں آتا تھا کہیں رلیج کو کچھ ہونہ جائے۔ بھانم بھاگ ہسپتال پہنچی تو نازش کا مٹھی کے باہر ہی مل گئی۔ وہ رو رہی تھی۔ سروش کا دل دھک سے ہو گیا۔ یہ لمحہ اس پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا۔ اس نے نازش کو جھنجھوڑ ڈالا۔ ”ناشی، ناشی، کیا ہوا ہے رلیج کو۔“

”وو، وو اہر ہے۔ آپریشن تھیمز میں شاید۔ وہ خون کے لیے کہہ رہے ہیں۔“ وہ آنسو پونچھتی ہوئی بولی۔



نسے دیکھتا رہا۔ پھر لپکام ہو کر بولا۔ ”شرم مجھے نہیں آپ کو آئے گی۔ جس روز آپ اقرار کریں گی۔ دیکھ لیجئے گا۔ اقرار تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا۔ سروش۔ پھر اس روز بہت نہ شرمائیے گا۔“

وہ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں دیکھ کر مسکرایا اور شائستگی سے خم ہوا۔

”اجازت..... مجھے امید ہے۔ ہم بہت جلد ملیں گے۔“



ساری رات سوچوں کی دوڑ میں الجھی رہی۔ وہ پٹیہان سی ہو کر سوچتی رہی کہ یہ سب کیا ہے۔ یہ کس طرح ہوا ہے اور کیوں ہوا ہے؟ وہ کس طرح اس غیر متوقع صورتحال سے مقابلہ کرے؟ کیا مگر عام کامن کرے؟ جو اس کے دل میں ویسے ہی احساسات جگا رہا ہے۔ جو کبھی عامر کے دم سے جاگ اٹھتے تھے۔ کیا وہ پھر فریب کھا رہی ہے۔ یہ کیا اسے پھر دھوکہ دیا جا رہا ہے۔ کیا وہ محبت کی بھول بھلیوں میں پھر گم ہو جانے کو ہے۔ اس کا ننھا سا پاگل دل اعتماد کر لینے کو بہانے تلاش کر رہا تھا۔ وہ خوفزدہ سی ہو گئی۔ بستر سے نکل کر کمرے میں چلتی رہی۔ نہ جانے کن گھنٹیوں کو سلجھاتی رہی۔ کن الجھنوں کو واضح کرتی رہی؟ کیا فیصلے کرتی رہی؟ کیا کیا سوچتی رہی؟

انگلی صبح جب وہ کالج جانے کیلئے تیار ہوئی تو بڑی پرسکون تھی۔ جذبات کی یورش اور خوفان سے نکل کر وہ مطمئن ہو گئی تھی۔ سارا اضطراب، تمام بے قراریاں اپنی جان پر جمیل کر وہ پھر معمولات میں گم ہو گئی۔ وہ یوں آسودہ سی ہو گئی جیسے اپنے فیصلوں پر پورا اعتماد ہو۔ جیسے اپنی ذات پر پورا بھروسہ ہو۔ جیسے خود پر اکتبار ہو۔

کالج میں دو ٹین بیرڈ لگا کر پڑھا کر وہ اسٹاف روم کی طرف آ رہی تھی کہ

موصول دیا۔ وہ اس کے ہارے میں سب کچھ بھول کر جلدی جلدی اسے تانے لگی کہ اسے اپنے بھائی کے لیے خون کی ضرورت ہے۔

”چلئے آئیے کوئی انتظام کرتے ہیں۔“ عامم نے اس کا بازو پکڑا اور اس شخص سے بولا۔ ”میاں جاؤ۔ اپنا کام کرو۔ ہم خود انتظام کر لیں گے۔“

سروش پریشان ہوئی۔ یہ کیا کیا آپ نے۔ وہ شخص تو خون کا انتظام کر رہا تھا۔ میں نے پتہ کر لیا ہے۔ بلڈ بینک میں اس کا گروپ نہیں ہے۔

”اس کا گروپ ابھی مل جائے گا۔ آپ چلئے تو سہی۔ سب کچھ مل جائے گا۔ وہ اس کے برابر چلتا ہوا بولا۔

بلڈ بینک کے قریب کھڑی ہوئی نازش ان کی طرف لہکی۔ ”آئی! خون کا کوئی انتظام ہوا؟“

”جی ہاں ہو گیا ہے بالکل۔“ اس کے بجائے عامم نے جواب دیا۔ سروش نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ انہیں دیا بھی چا چکا ہے۔ اور اب وہ بہتر ہیں۔

”ہائے اللہ شکر ہے۔“ نازش نے آنکھیں میچ کر کہا۔

”آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ سروش نے عامم سے حیران ہو کر پوچھا۔

نازش نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”ارے آپ کی ایسی تو ہیں۔ جنہوں نے مجھے اور راجہ کو ہسپتال پہنچایا ہے۔ شکر ہے۔ یہ وہاں سے گزر رہے تھے۔ نہیں تو پتہ

نہیں کیا ہو جاتا۔“ وہ پھر رو ہانسی ہوئی۔

”ارے ارے اب آپ رونے مت بیٹھ جائیے۔ آپ کی آپ کی آپ کی کسر

بھی پوری کر رہی ہیں۔ وہ خوش طبعی سے بولا۔ تو سروش نے چونک کر اپنی آنکھیں خشک

کر لیں اور ہولے سے بولی۔ ”عامم صاحب! میں بہت ممنون ہوں اگر آج آپ مدد نہ

کرتے تو ہماری دنیا اندھیر ہو جاتی۔“

سروش پریشانی میں بلڈ بینک کی طرف دوڑی۔ ان کے پاس حسب معمول اس کا گروپ موجود نہیں تھا۔ اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اگر راجہ کو کچھ ہو گیا تو؟ یہ خوفناک خیال کسی کھڑی کی طرح اس کے ذہن سے چپک کر رہ گیا تھا۔ مارے گھبراہٹ کے کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ پاؤں کھینک رکھتی تھی۔ اور پڑتے کہیں تھے۔ کسی کو ساتھ بھی تو نہیں لے کر آئی تھی۔ یہ سوچ کر زہیب کو نون کر کے بلوالے۔ وہ اکھڑے اکھڑے سے قدم یعنی باہر لگی تو سامنے سے آنے والے اک جیب وغریب ملنے کے آدی نے سگریٹ کا زور دار کش لے کر راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”کیوں بی بی، کوئی خون شون چاہیے۔“

سروش ٹھٹک گئی۔ یہ شخص رحمت کا فرشتہ بن کر آیا تھا۔ اس نے جھٹ میں سر ہلایا۔

”کون سا گروپ۔“ اس نے چنگلی بھلا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑی۔ سروش نے گروپ بتایا تو وہ سر ہلا کر بولا۔ ”بی بی! مل تو جائے گا۔ پر ڈراما مال شال نکا پڑے گا۔“

سروش ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ ”ہاں تم جیبوں کی نکلنے کرو۔“ اس نے

پرس کھولا۔ اس وقت کسی نے قریب آ کر کہا۔ ”خیریت تو ہے۔ مس سروش! سروش نے

سراٹھا کر دیکھا۔ عامم قریب ہی کھڑا فکر مندی سے پوچھ رہا تھا۔ سروش اسے اس طرح

سامنے دیکھ کر حیران ہی ہوئی۔ وہ جس فکر مندی سے استفسار کر رہا تھا۔ اس نے اسے

جک کر کہا۔ ”ہمیں پھر آنے کی اجازت ہے۔“

سروش نے کچھ بھی جواب نہیں دیا۔ غیر ارادی طور پر اس کا سر اٹھاتے میں مل گیا۔

بہت دلوں بعد کہیں راجہ اٹھنے کے قابل ہوا تھا۔ لیکن کمزوری اب تک باقی تھی۔ زخم مندمل ہو رہے تھے۔ اک ٹوٹا ہوا بازو گنگے کا پار بنا ہوا تھا۔ اب وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ سکتا تھا۔ سروش اس کے قریب بیٹھی سب کاٹ رہی تھی اور برابر اس کو ڈانٹ رہی تھی۔

”شرم تو نہیں آئی۔“ ڈھیٹ کو کتھی بار کہا ہے کہ دوسروں کے سکوٹنے کرن

مگھو مارے۔ لیکن تجھے اثر ہی نہیں ہوتا۔“

”اوہو۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔ سکولر کی بریکیں ہی ڈھکی تھیں۔“

سروش نے آنکھیں نکالیں۔ ”پھر کس نے کہا تھا تجھ سے کہ ناشی کو ساتھ

بٹھا۔“

”حیرت ہے کہ یہ بچا کیسے گئی۔“ راجہ بے ساختہ ہنسا۔ ”میرا تو جو حشر ہونا تھا

سوہوا۔ مجھے تو فکر تھی اس ناشی کی بچی کی۔ پر شکر ہے کہ بچا ہی گئی۔“

”بالائق نہ ہو تو، آئندہ اگر تو نے ایسی حرکت کی تو دیکھنا۔ سروش نے اس کا

کان ہولے سے مروڑا۔

”ہائے اللہ امی دیکھیں یہ مجھے مار رہی ہے۔“ وہ دہائی دینے لگا۔

امی افس پڑیں۔ ”تیرے بھلے کوئی کہتی ہے نا۔ تو تو چوٹ لگوا کر بیٹھ گیا اور

ہزاری جان سولی پر لگی ہے۔“

راجہ کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ”آ جاؤ بھتی۔ دو ازہ کھلا

ہے۔“ راجہ نے ہی بلند آواز میں کہا۔

”کیوں شرمندہ کر رہی ہیں۔“ اس نے فس کر کہا۔ تو سروش نے اس کی

طرف غور سے دیکھا۔ اس کی قمیض پر خون کے دھبے تھے۔ اس نے پریشان ہو کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”یہ کیا ہوا آپ کو۔“

عامم نے محض نظر سے اس کے ہاتھ کی طرف دیکھا تو اس نے مجھب ہو کر ہاتھ اٹھالیا۔ وہ تھوڑا سا نم ہوا۔ ”اس القات کے لیے نوازش۔ ویسے ہمیں کچھ نہیں ہوا۔ یہ خون آپ کے بھائی کو اٹھاتے ہوئے لگ گیا ہے۔“

”راجہ کا خون۔“ سروش کا دل اٹک سے رہ گیا۔ پریشان ہو کر نازش سے بولی۔ ناشی یہ نہیں اس کا کیا حال ہے، آؤ ذرا چل کر دیکھیں۔“

”آپ فکر مند نہ ہوں۔ وہ خطرے سے باہر ہیں۔ شاید ابھی بیڈ پر پہنچا دیئے جائیں گے۔“ عامم نے اطلاع دی۔

”بچ بچ عامم صاحب! بہت احسان کیا آپ نے نازش اس کا شکر یہ داکر نے ہوئے بہتر سے بہتر نظروں کی تلاش میں تھی۔ عامم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔“ زیادہ نہیں بولا کرتے۔ چپ رہتے۔“

سروش نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن الفاظ نے ساتھ نہ دیا۔ اس نے اک تشکر آمیز نگاہ عامم پر ڈالی۔ آنسوؤں سے بھٹی ہوئی۔ احسان مندی کے جذبات سے لدی ہوئی اس ایک نگاہ میں وہ کچھ تھا جو الفاظ میں کبھی نہیں سا سکتا۔ عامم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”مجھے اجازت ہے۔“

”آپ پھر کبھی ضرور آئیں۔ ابھی تو راجہ بھائی ہسپتال میں ہی ہوں گے، امی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔“ نازش نے خوش اخلاقی سے کہا۔

تو عامم نے اک نگاہ سروش پر ڈالی۔ اس کے احساسات متضاد سے ہو رہے تھے۔ وہ کچھ کہ نہیں پاتی تھی۔ نازش پلٹے کو ذرا آگے ہوئی تو عامم نے اس کے قریب

”نہیں۔ نہیں۔ یہ کسی تکلف کا موقع نہیں۔“ عاصم جلدی سے بولا۔  
 نازش اٹھ کر پلیٹ میں پھل وغیرہ رکھنے لگی۔ امی نے محبت سے کہا۔ ”نہیں  
 بیٹا۔ تکلف کیسا۔ اللہ رکھے رعبہ اچھا ہو جائے۔ تو تمہیں گھر بلائیں گے۔ ہمارا بھی جی  
 چاہتا ہے۔ تمہاری خدمت کرنے کو۔“

وہ جواباً کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ سروش نے دروازہ  
 کھولا۔ تو ایک باوردی ڈرائیور نے اندر جھانکا۔ اس نے پھلوں کی ٹوکری اور گلدستہ اٹھا  
 رکھا تھا۔

”اندرا جاؤں گی؟“ اس نے پوچھا۔

رعبہ نے حسمت سے کہا۔ ”ضرور آ جاوے جنتاب! جس طرح آپ لہے  
 پھندے چلے آ رہے ہیں۔ آپ کو روک کر ہمیں گناہگار نہیں ہونا۔ ویسے تو آپ غلطی  
 سے ادھر آ گئے ہیں۔ لیکن اب آ گئے ہیں۔ تو آئی جاوے۔ اتنا سامان اٹھا کر آپ کہاں  
 مارے مارے پھریں گے۔“

عاصم اس کی بات سے مفلوظ ہوا۔ وہ پھل اور گلدستہ رکھ کر چلا گیا۔ تو امی نے  
 رعبہ کو ڈانٹا۔

”رعبہ یہ کیا حماقت ہے؟“

”حماقت کیا۔ یہ سارا پھل یہاں ہم غریب مریضوں میں بانٹیں گے۔ اب یہ

دروازہ کھلا اور عاصم کا چہرہ دکھائی دیا۔ رعبہ نے سرگھا کر اس کی طرف دیکھا۔  
 امی نے بھی غور سے دیکھا وہ دونوں اسے نہیں پہچانتے تھے۔ سروش نے اسے اندر آنے  
 کیلئے کہا۔ اور امی کو بتایا کہ وہی رعبہ کو ہسپتال لے کر گیا تھا۔

امی نے اٹھ کر بڑے تپاک سے اس کی بلائیں لیں۔ اور دعائیں دینے  
 لگیں۔ اس غیر معمولی استقبال سے وہ کچھ حینپ سا گیا۔ اور خوش اخلاقی سے بولا۔  
 ”میں نے کوئی احسان نہیں کیا۔ یہ تو ہر انسان کا فرض ہے۔“

”بیٹا کتنے لوگ ہیں جو اپنا فرض پہچانتے ہیں۔“ امی نے کہا۔ ”تم نے  
 مصیبت کے وقت ہماری مدد کی ہے یہ بات بھولنے کی نہیں ہے۔“

وہ سنی ان سنی کر کے رعبہ کی طرف بڑھ گیا۔ رعبہ نے گرجوٹی سے بایا، ہاتھ  
 ملایا اور خوش دلی سے بولا۔ ”عاصم صاحب! آپ نے اپنا فرض پہچانا ہے۔ یہ بہت بڑی  
 بات ہے۔ ان کو اس کا تذکرہ کچھ دیر کرنے دیجئے۔ اور ذرا اس پر غور کیجئے۔ پھر دیکھئے  
 کتنا مزہ آتا ہے اپنی تعریف سنتے میں۔“

عاصم مفلوظ ہوا۔ ”شاید پ کو اپنی شہریت کرانا بہت پسند ہے۔“

”جی ہاں بہت زیادہ۔“ وہ ہنسا۔ ”ابھی یہ سروش بیٹی میری شان میں قصیدہ  
 پڑھ رہی تھی۔“

”اور ساتھ اس نے کان بھی مروڑی تھی۔“ نازش نے بھی دخل دیا۔

”میں اور کچھ مت کہنا۔ رعبہ جلدی سے اس کی بات کاٹ کر بولا۔ اب ذرا  
 اٹھ کر عاصم صاحب کی کچھ حاضر تواضع بھی کرو کہ یہاں سے صرف دو بیویوں کی بوسہ لگے  
 چلے جائیں گے۔“



آگے۔ عامم اس کے مقابلہ رک گیا۔ سروش: آپ کہاں چلی گئی تھیں؟  
 ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ اس کے ساتھی ڈاکٹر نے بے تکلفی  
 سے ہاتھ بڑھایا۔ ”واہ... واہ... واہ...“ مس سروش! مجھے نہیں پتہ تھا کہ میری دعائیں اتنی  
 جلدی مقبول ہو جائیں گے۔ میں تو روز و عاتما لگتا تھا کہ آپ سے پھر ملاقات ہو۔“  
 اب سروش نے پچھانا کہ وہ ڈاکٹر عادل تھا اور دل ہی دل میں گھبرائی۔ کہ اب  
 اس سے جان چھڑانا مشکل ہوگا۔ وہ بڑی توجہ کے ساتھ اس سے پوچھ رہا تھا کہ ہاسپٹل  
 میں اس کا کون مر بیٹھ ہے۔ سروش نے جلدی جلدی اس کی باتوں کے مختصر جواب دیئے  
 اور بولی۔

”جی اجھا۔ میں چلتی ہوں۔“

”جی نہیں آپ نہیں جائیں گی۔“ ڈاکٹر عادل نے فوراً ہی اس کا بازو پکڑ لیا۔

سروش گڑبڑائی۔ اس نے گھبرا کر بازو چھڑا دیا۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

”میں آپ کو روک رہا ہوں۔ کیوں ابھی آپ نے ہمارے ساتھ چائے پیٹی

ہے۔“ ڈاکٹر عادل نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

”جی نہیں۔ شکر یہ!“ سروش نے جلدی سے کہا۔

”لیجئے۔ بھلا چائے پیٹے بغیر ہی شکر کیے کا کیا تک۔“ وہ بدستور اس کا بازو

تھامے ہوئے ہوا۔ ”مس سروش! میں بڑا پر غلوس انسان ہوں اور اپنے غلوس کی قدر

کروان اپنا فرض اولین سمجھتا ہوں۔“

سروش نے شینا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”آپ میری بات کیوں نہیں سنتے۔“

”معاف کیجئے میرے کان کمزور ہیں۔“ اس نے برہنہ کہا۔

سروش کو لگی آگئی۔ ”دیکھئے میں چائے نہیں پیٹی ہوں۔“ اس نے بہانہ بنایا۔

”تو پھر آج بی کر دیکھئے۔ واہ۔ کیا مزیدار چیز ہے۔ ہم تو اس کو انسان ہی

کتی زیادتی ہے کہ ایک اکیلا آدی۔ اتنا سارا پھل کھا جائے۔ اس کو کچھ دوسروں کا  
 خیال بھی رکھنا چاہیے۔“ راجہ نے تلفظ بگھارا۔

عامم بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سروش کو کچھ شک سا ہوا۔ اس

نے کڑی لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ آپ کا ڈرامیو تھا عامم صاحب!“

عامم نے جواب نہیں دیا۔ بس کہنا لگا چاہا۔ امی نے تکلف سے کہا۔ ”بیٹا! تم

نے اتنا تکلف کیوں کیا؟“

راجہ ہوا۔ ”عامم صاحب! یہ اتنے سارے پھل تو آپ اپنے دست مبارک

سے تمام مر بیٹھوں میں تقسیم کر آئیں۔ اگر میں نے یہ سب کچھ کھا لیا۔ تو کہیں کچھ روز

زیادہ ہی ہاسپٹل میں نہ رہنا پڑے۔“

عامم نے موضوع بدل دیا۔ کافی دیر خوشگوار باتیں ہوتی رہیں۔ لیکن سروش

نے بہت کم گفتگو میں حصہ لیا۔ وہ خود میں ہی الجھی ہوئی تھی۔ عامم کی موجودگی اسے بار

ہونے لگی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ وہ اس کے گھر والوں سے بے تکلف ہو۔ اس کی

نوازشات اسے خائف کر رہی تھیں۔ اس کے اندر تکلیف اور بے چینی بڑھ رہی تھی۔ اس

ماحول سے نکلنے کیلئے وہ خاموشی سے اٹھی اور آہستگی کے ساتھ کمرے سے نکل گئی۔

وہ یونہی بے مقصد ہاسپٹل کے سبزہ میں گھومتی رہی۔ لیکن عامم کا تصور اس

کے ساتھ ساتھ تھا۔ من الجھا ہوا تھا۔ اور حالات بھول بھلیوں کی طرح لگ رہے تھے۔

وہ کافی دیر تک خود ہی کھوئی ہوئی ٹہل ٹہل کر وقت گزارتی رہی۔ پھر اس نے گھڑی

دیکھی۔ اتنا وقت گزر گیا تھا کہ عامم یقیناً چلا گیا ہوگا۔

یہ سوچ کر وہ ٹٹٹی۔ لیکن جیسے ہی راہداری میں داخل ہوئی۔ دھک سے رو گئی۔

اس کا جی چاہا کہ وہ واپس پلٹ جائے۔ مین سامنے عامم کسی ڈاکٹر سے باتیں کرتا ہوا آ رہا

تھا۔ وہ وہیں ٹھک کر ابھی فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ کیا کرے۔ تب تک وہ دونوں قریب

کام ہے۔

سروش اسے نظر انداز کئے ہوئے اپنے لئے چائے بنانے لگی۔ وہ بڑی سنجیدگی کے ساتھ اپنا فلسفہ بگھار رہا تھا۔ ”مس سروش! آپ بھی ایک خاتون ہیں۔ خواتین کے رویے، ان کے جذبات، ان کے محسوسات کے بارے میں ہم سے بہتر جانتی ہیں۔“ اس نے یوں تھوڑا توقف کیا۔ جیسے اس کا رد عمل دیکھنا چاہتا ہو۔

سروش ایوں لائق سی بیٹھی چائے پیتی رہی۔ جیسے اسے اس کی بات سننے کا کوئی اشتیاق نہ ہو۔ ڈاکٹر عادل بھی خاموش ہی رہا۔ اور خاموشی کا وقفہ طویل ہوا۔ سروش نے اب بھی کسی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا۔

ڈاکٹر عادل نے زور سے پیالی میز پر رکھ دی اور روٹھا ہوا سا بولا۔ ”مس سروش! آپ تو میری بات سن ہی نہیں رہیں۔“

”سن تو رہی ہوں۔ یا آپ کی بات سننے کیلئے امیٹرنگ ایڈ کی ضرورت ہوتی ہے۔“ سروش نے بوجھت کہا۔

وہ کھل کر سسکرایا اور پھر رواں ہو گیا۔ ”ہاں۔ تو میں کہہ رہا تھا مس سروش! کہ آپ سے مشورہ یہ لینا ہے کہ میرے ایک بہت ہی عزیز دوست کو ایک بہت پیاری لڑکی سے ’وہ‘ ہو گئی ہے۔ ’وہ‘۔ یعنی محبت۔!!! مگر اب مشکل یہ ہے کہ یہ بات کیسے معلوم کی جائے کہ اس لڑکی کو بھی اس سے محبت ہے۔“

سروش گڑبڑائی۔ اسے اس کی توقع نہیں تھی کہ وہ یوں براہ راست بات کرنے لگے گا۔ وہ خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے کے باوجود کچھ گھبرا سی گئی۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ وہ دونوں بڑے غور سے اس کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ ان دونوں چالاک مردوں کو اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا اور روکھائی سے بولی۔ ”میں آپ کو اس بارے

نہیں سمجھتے جو چائے نہیں پیتا۔ بس اب انکار نہ کیجئے گا۔ کفرانِ نعمت کریں گی۔ توجیح کج کافی گناہ ملے گا۔“ وہ بہت مزے سے کہتا جا رہا تھا۔

سروش قدر سے تلخ ہوئی۔ ”آپ خواہو تو مجھے مجبور کر رہے ہیں۔“

”تو آپ مجبور ہو جائیے ناں پلیز۔“ اس نے ایک شریر سی التجا کی۔

”دیکھئے اب دل تو نہ توڑیے۔“ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلا ہوا۔ یوں بات کر رہا تھا۔ جیسے اسے نہ جانے کب سے جانتا ہو۔

سروش عجیب مصیبت میں گرفتار تھی۔ وہ اپنی عقلگی اور بے ضروری بے تکلفی سے بات کرتا تھا کہ اسے کوئی سخت جواب بھی نہیں دیا جاسکتا تھا۔ اس کے دلچسپ رویے اور مضحکہ خیز حرکتوں سے ماحول کچھ ایسا بن گیا تھا کہ کتنی پیہا نہیں کی جاسکتی تھی۔

یہاں تک کہ وہ اس کے ساتھ ساتھ چلا ہوا۔ اپنے کمرے تک پہنچ گیا۔

جب وہ چائے بنا رہی تھی۔ تو وہ قریب ہی صوفے پر بیٹھا ہوا بڑی مصوویت سے پوچھ رہا تھا۔ ”مس سروش! ذرا اتنا تو بتا دیجئے کہ آپ کو دل وغیرہ توڑنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟“

سروش نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن وہ عام کی گہری نگاہوں کو اپنے چہرے سے چھوٹے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ وہ دل ہی دل میں بے طرح الجھ رہی تھی۔ یہ ڈاکٹر بھی ایک پٹا نہ ہی تھا۔ وہ خاصا عجیب و غریب باتیں بڑی سہولت سے اس طرح کہہ دیتا تھا کہ وہ بالکل بے ضروری محسوس ہوتی تھی۔

وہ مسلسل اوٹ پٹانگ بولتا جا رہا تھا۔ سروش اس کی بات پر بالکل کان نہیں دھری تھی۔ اس نے چائے بنا کر بیانی اس کی طرف بڑھائی۔ تو وہ بولا۔ ”مس سروش! میں آج کسی خاتون سے ایک چھوٹا سا مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ اچھا ہوا کہ آپ مل گئیں۔ اب میں آپ سے ہی پوچھ لیتا ہوں۔ دیکھیں ناں کسی کو نیک مشورہ دینا بہت ثواب کا

کیسے جانے دے ان کا دوست۔ اس لڑکی کو۔“

سروش اس کے براہ راست مخاطب سے چڑھی گئی۔ اس نے بات کی تو اس کا لہجہ بہت تلخ تھا۔ ”عام صاحب میں آپ کی عزت کرتی ہوں۔ لیکن اگر آپ نے اپنا رویہ نہیں بدلا۔ تو میں اس کا پاس نہیں کر سکوں گی۔ مجھے آپ سے اس کی توقع نہیں تھی کہ آپ مجھے اپنے دوستوں میں رسوا کرتے پھیریں گے۔“

”اوہ۔ آپ کیا سمجھ رہی ہیں؟“ وہ یکدم پریشان ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے تھاما اور ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ اس کا چہرہ خستہ تھا۔

”مس سروش! پلیز اپنی یہ غلط فہمی فوراً دور کر لیجئے۔ میں نے کسی سے بھی آپ کا تذکرہ نہیں کیا۔ عادل میرا بچپن کا دوست ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے۔ خود سے کہا ہے۔ لیکن کسی بڑی نیت سے نہیں۔ ایسی بات کبھی سوچنے کا بھی نہیں۔ بخدا! آپ کی عزت میری عزت ہے۔ میں آپ کو کیوں سوا کروں گا۔ میں تو آپ کو باعزت طریقے سے اپنانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ رضا مند ہوں۔ تو میں صدف کو آپ کے گھر بھیجوں۔“

سروش لمبے بھر کو کن سی ہو گئی۔ یہ اچانک اس نے کیا کہہ دیا تھا۔ کہ لمبے ایک خوبصورت سوال میں ڈھل گئے تھے۔ محبت ایک بار پھر اس کے متناہل عام صاحب کی صورت میں آن کھڑی ہوئی تھی اور مسکورت دینے والی لگا ہوں سے اس کے رگ و پے میں جا دو سا بگا رہی تھی۔

وہ بے طرح پریشان ہوئی۔ ناپائیدار محبتوں کا کھیل پھر ایک بار کھیلنا لا حاصل تھا۔ اس نے متانت سے اپنا فیصلہ سنایا۔ ”عام صاحب! آپ مجھے مجبور سمجھ کر سنا کر دیں۔ اور صدف کو اس معاملے میں مت الجھائیے۔ وہ میری دوست ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ کسی وجہ سے اسے دکھ پہنچے۔ یا مجھے اس سے قطع تعلق کرنا پڑے۔“

”نہیں سروش! فیصلہ کرنے میں اتنی جلدی نہ کیجئے۔ وہ ملاکت سے بولا۔“

میں کیا مانے دے سکتی ہوں۔“

”خدا کیلئے مس سروش! ایسا کورا جواب تو نہ دیجئے پلیز!“ اس نے دہائی دی۔

سروش کو کھسی آ گئی۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کیوں دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ آپ کے دوست جانیں یا وہ لڑکی۔“

”وہ۔ ہو ہو ہو۔! یہ ان کا ذاتی معاملہ نہیں ہے نا۔“ وہ ابھی کوئی چیز ترا بدلنے والا تھا کہ نرس اسے بلانے کیلئے آ گئی۔ وہ سخت بیزارگی کے عالم میں اٹھا۔ بہت جھنجھٹایا اور اس سے معذرت کرتا ہوا بولا۔ ”دیکھئے مس سروش! یہ بات بڑی اہم ہے۔ مجھے کہ موت زندگی کا معاملہ ہے۔ آپ کی جو بھی رائے ہو۔ عام کو بتادیں۔“

”جی نہیں۔ میں بھی چل رہی ہوں۔“ سروش بھی جلدی سے اٹھ گئی۔

”ارے نہیں۔ نہیں۔ ہرگز نہیں!! وہ جو دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ وہیں سے پلٹ کر بولا۔“ ایسا غضب بھی نہ کیجئے گا۔ آپ کو قسم ہے۔ جو بھی آپ کی رائے ہے۔ وہ عام کو بتا کر جائے گا۔“ وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرنا ہوا ہر نکل گیا۔

سروش شہنا سی گئی۔ وہ دونوں مل کر اسے یہ توقف بنا رہے تھے۔ عام بڑے اطمینان سے صوفے پہ بیٹھا۔ دلچسپی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ وہ بغیر کچھ کہے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ عام تیزی سے اٹھ کر راہ میں آ گیا۔

”کچھ دیر تو رکھیے سروش!“

”دروازے سے ہٹ جائیے۔“ وہ ترشی سے بولی۔

”دروازے پر تو اسی وقت کھڑا ہوا جاتا ہے۔ جب کسی کے چلے جانے کا اندیشہ ہو۔“ وہ سادگی سے کہنے لگا۔

سروش چند قدم آگے بڑھی اور سنجیدگی سے بولی۔ ”جانے دیجئے مجھے۔“

”ابھی تو آپ نے عادل سے کہا تھا کہ وہ لڑکی جانیں یا ان کا دوست۔ تو پھر

کے بعد ہاتھوں میں بیگ اٹھائے وہ فٹ پاتھ پر کسی سواری کے انتھار میں کھڑی تھی۔  
کہ اسے محسوس ہوا۔ جیسے کسی نے اس کا ہاتھ لے کر اسے پکارا ہے۔

اس نے آواز کی سمت دیکھا۔ ایک لمبی کار کے آدھ کھلے دروازے میں سے  
ایک ماڈرن سی خوبصورت لڑکی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سروش اسے پہچانتی نہیں تھی۔  
اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پکارا وہ بولی۔ "میں تمہیں جانتی ہوں۔"

سروش قریب چلی گئی۔ وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی انگریزی میں بولی۔ "تم ہو  
سروش مندر علی؟"

سروش نے سیاہ چشمہ اتار کر ہاتھ میں لیا اور بولی۔ "میں نے آپ کو پہچانا  
نہیں۔"

"میں حمیرا نجم الدین ہوں۔" اس کا لہجہ پر غرور تھا اور انداز میں ایک چہیتا  
ہو سا تھا فرقا۔ اس کی تنقیدی نگاہیں اسے سر سے چیر تک دیکھ رہی تھیں۔

سروش ابھی تک اس کا مقصد نہیں سمجھ سکی تھی۔ اور سوالیہ نگاہوں سے اس کی  
جانب تک رہی تھی۔ اس لڑکی نے سر کو کئی بار جنبش دی۔ "اچھا۔ تو تم ہو سروش! دیکھنے  
میں تو بڑی سیدھی سادی لگتی ہو۔" اس کا انداز تنقیر آمیز تھا کہ سروش ہکا بکارہ لگی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے برہمی سے کہا۔

"مطلب؟" اس نے تسنن سے دہرایا۔ "بہت بھولی بن رہی ہو۔ ہیں۔"

"تمیز سے بات کرو۔" سروش نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

"واہ..... بڑے مزاج ہیں۔" اس کا لہجہ طعنیہ تھا۔ "نبی ادا میں دکھاتی ہو۔"

عالم کو بھی۔"

سروش سنائے میں رہ گئی۔ یہاں عالم کا کیا تذکرہ تھا؟

حمیرا نے کمان ایسے اردو اچکاے۔ "عالم میرا انگلیتر ہے۔ سمجھیں تم۔ اس کا

سروش کو اس کی آنکھوں میں جھلکاتے ان گنت ستاروں کی جھلک اپنی روح  
میں اترتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ ان آنکھوں سے لگا ہوں چھا گئی۔ اور تنقید کی سے گویا  
ہوئی۔ "عالم صاحب مجھ پر میرے خاندان کی ذمہ داری ہے۔ اور اس سے بڑھ کر کوئی  
بات اہم نہیں۔"

"تو یہ بات ہے۔" وہ اطمینان کا مبرا سانس لے کر بولا۔ "تو آپ اس لیے  
دامن بچا رہی تھیں۔ مگر یہ تو ایسی بات نہیں ہے کہ اس کے لیے آپ اپنی ساری خوشیاں  
داؤ پر لگا دیں۔ آپ میری زندگی میں آجائے۔ آپ مجھے ہمیشہ اپنے برابر کھڑا ہوا پائیں  
گی سروش!"

"نہیں ہرگز نہیں۔ میں احسانوں کا یہ ہار گراں اٹھا کر زندگی نہیں گزار سکتی۔"  
سروش نے قطعی لہجے میں کہا اور اٹھ کر جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔  
عالم نے بھی اسے نہیں روکا۔



دلچہ گھر آ گیا تھا اور پوری طرح سے تندرست تھا۔ سروش کی بھی جان میں  
جان آئی۔ ورنہ ہاسٹل میں تو ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ عالم اب آیا کر جب آیا۔  
ہر آہٹ پر ہر دستک پر اسی کا گمان ہوتا تھا۔ وہ اپنے آپ میں ہی جھنجھلا جاتی۔ بھلا وہ  
عالم کے بارے میں کیوں سوچنے لگی تھی۔ اسے تو اس خوبصورت غلطی کا اعادہ پھر نہیں  
کرتا تھا۔ جس نے اسے اپنی ہی نگہوں میں تنقیر کر دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی اپنے  
خاندان کے نام کر دی تھی۔ اب اسے کسی اور سے کوئی غرض نہیں تھی۔

زندگی اپنے معمول پر آ گئی تھی۔ بہت سے ایسے کام جو دلچہ کی بیماری کی وجہ  
سے ملتوی ہوتے رہے تھے۔ سروش انہیں بھی ساتھ ساتھ ہنسا رہی تھی۔ ایک روز خریداری

اس نے گھر میں کسی کو پتہ نہیں چلنے دیا تھا کہ اسے ملازمت سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ وہ ٹیوشن پڑھا کر گزارا کرنے لگی۔ اس نے ٹائپ کرنا بھی سیکھ لیا۔ لیکن کام نہیں بنا۔ وہ کہیں درخواست دیتی۔ کہیں انٹرویو۔ اور کہیں ٹیوشن پڑھاتی۔ گھر کا گزارا جیسے تیسے ہو رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر عاصم پر غصہ آتا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اس لڑکی کے انتقام کا نشانہ بنی تھی۔ وہ اسے کھری کھری سنا چاہتی تھی۔ لیکن اتفاق ایسا تھا کہ اس کا کہیں سامنا نہیں ہوا۔



بچھا چھوڑ دو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔“  
سروش کو اپنی سماعت پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کے ساتھ کبھی کسی نے اس انداز میں بات نہیں کی تھی۔ وہ پوری جان سے ہل کر بولی۔ ”عاصم تمہارا منگیتر ہے یا جو کچھ بھی ہے۔ اسی سے بات کرو۔ راہ چلنے جنہیں مجھ سے بدتمیزی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ سروش اتنا کہہ کر چیزی سے آگے نکل آئی۔ لیکن اس کا خون کھول رہا تھا۔ ایسی تو جین تو کبھی کسی نے نہیں کی تھی۔ اسے رہ رہ کر عاصم پر ہی غصہ آ رہا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کی اتنی بے عزتی ہوئی تھی۔ عاصم کی اصلیت بھی کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ جو اتنی خوبصورت منگیتر کے ہوتے ہوئے اسے فریب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

گھر آ کر بھی وہ پریشان ہی رہی۔ دھیان کی طرف ہی نہیں تھا۔ اس لڑکی کی تو جین آ میز باتیں۔ تحقیر آمیز نگاہیں۔ اسے بھولتی ہی نہیں تھی۔ وہ لڑکی چوٹ کھائی ہوئی نامن کی طرح پھینک رہی تھی۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔  
اگر وہ گھر آ جاتی یا کالج پہنچ جاتی۔ تو وہ کس کس کے سامنے اپنی صفائی پیش کر سکتی۔ کس کس کو مطمئن کرے گی۔

عاصم نے اسے کچھ مصیبت میں ڈال دیا تھا۔ عامر کی بے وفائی کے زخم پھر ہرے ہو گئے تھے۔ عاصم بھی تو اس کی طرح اپنی منگیتر کو دھوکا دے رہا تھا۔ اس سے بچھا بچھا چاہتا تھا۔

اس بات کو ابھی کچھ زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ وہ کچھ ہو گیا۔ جس سے وہ ڈر رہی تھی۔ حمیرا نجم الدین کے انتقام کی آگ اس تک آ پہنچی تھی۔ اسے بغیر وجہ بتائے کالج سے فارغ کر دیا گیا تھا۔ اسے پتہ چلا تھا کہ حمیرا نجم الدین کے والد اس کے کالج کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل تھے۔ سروش کچھ بھی نہیں کر سکی۔ لیکن وہ کم ہمت نہیں تھی۔ اس لڑکی نے آغاز کر دیا تھا۔ تو وہ اس کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھی۔

اس کے سرٹی مائل بھورے بال بڑے خوبصورت انداز میں سنورے ہوئے تھے۔ اس سے شدت نفرت کے باوجود سروش کو احساس ہوا کہ وہ بے حد حسین لگ رہی ہے اس نے غیر ارادی طور پر عام کی طرف دیکھا کہ وہ کس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن اس کے چہرے پر بیزارگی اور اکٹاہٹ تھی۔



سروش دانستہ طور پر خاموش رہی وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔ آج عام کا پول کھلنے والا تھا۔ وہ اس کے غصے اور جھنجھلاہٹ سے محظوظ ہوئی وہ بڑی خشکی سے حیرا سے کہہ رہا تھا حیرا میں نے آپ سے فون پر بھی کہا تھا کہ آج میں مصروف ہوں۔

”ہوں۔“ اس نے ایک ادائے درباہانہ سے عام کی طرف دیکھا ایسے میں سروش کو اس کی آنکھوں کی بے پناہ خوبصورتی کا احساس ہوا۔ نہ جانے کیوں اسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ وہ اس معمولی سی سرٹی ساڑھی اور بے احتیاطی سے بنائے ہوئے جوزے میں بالکل اچھی نہیں لگ رہی۔

حیرا نے بڑی نزاکت سے ہاتھ عام کے شانے پر رکھا۔ ”عام! میں تمہاری مصروفیت دیکھ رہی ہوں۔ عام نے بیزارگی سے اس کا ہاتھ اپنے شانے سے ہٹا دیا۔ وہ سروش کی وجہ سے کچھ جھینپ رہا تھا شاید اسی لئے جیسے اس سے پیچھا بھڑانے کو بولا۔ ”حیرا آپ اس وقت تشریف لے جائیے پلیز!“

”کیوں؟“ وہ نخوت سے سراٹھا کر بولی۔ عام چڑ گیا۔ ”دیکھتی نہیں ہیں آپ کہ مجھے یہ انٹرویوز بارہ بجے تک ختم کرنے ہیں اور باہر بھی پندرہ میں خواتین اور بھی موجود ہیں۔“

وہ انٹرویوز بے جلی آئی تھی۔ لیکن جب اس نے حیرا کو خوبصورت اور انٹراڈرن لڑکیوں کو دیکھا تو بے حد بددل ہوئی۔ اسے اپنا ناکامی کا یقین ہو گیا۔ اس طرح پہلے بھی کئی بار ہوا تھا۔ کہ کوئی خوبصورت اور ماڈرن لڑکی منتخب کر لی گئی تھی۔ اور وہ یونہی ناکام واپس آئی تھی۔

سادہ سی سرٹی ساڑھی میں وہ خود کو دوسری لڑکیوں سے بہت مختلف پارہی تھی۔ ان کی تسخراڑراتی ہوئی نگاہوں سے وہ جزبہ ہو رہی تھی اپنا نام سن کر وہ جھجکتی ہوئی انہی اور اس کمرے میں بیٹھی جہاں انٹرویوز ہو رہے تھے۔ ڈائریکٹر صاحب کوئی فون کر رہے تھے۔ سروش نے ایک اپنٹی سی نگاہ ان پر ڈالی اور ٹھک گئی اس نے پھر غور سے دیکھا اس کی روح آنکھوں سے سمت آئی اس کے سامنے عام تھا۔

”جو قدرے حیرت سے کہہ رہا تھا مس سروش آپ یہاں۔“

سروش اسے اس طرح اچانک غیر متوقع طور پر دیکھ کر گنگ سی ہو گئی تھی۔ اسے ایک ایک بات یاد آگئی تھی وہ غصے سے کانپ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کرے۔ وہ انتہائی نفرت انگیز الفاظ استعمال کرنا چاہتی تھی۔ وہ اس کی ویسی ہی توہین کرنا چاہتی تھی جیسی کہ اس کی اپنی ہوئی تھی۔ وہ دانستہ نہیں کر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ سامنے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی اندر آئی دونوں نے بیک وقت دیکھا آپ رواں ایسی باریک ساڑھی میں قیامت نبی ہوئی حیرا جم الدین ان کے سامنے تھی

خواتون۔“

”نہیں ہوگا یہ بالکل نہیں ہوگا اور کبھی نہیں سمجھیں آپ وہ انتہائی غصے سے بولا۔“ آپ تشریف لے جاسکتی ہیں۔“

سروش بڑی حیرت سے کبھی ایک کی طرف دیکھ رہی تھی تو کبھی دوسرے کی طرف حیرانے بنا کر کہا ”سروش تم جو کچھ چاہتی ہونا کبھی نہیں ہوگا۔ تم بھی یہ سمجھ لو اسے خود سے مخاطب دیکھ کر وہ چونک گئی عاصم نے سختی سے کہا حیرانہ جہیں یہاں اس آفس میں کسی معزز خاتون کی توہین کرنے کا حق نہیں تم فوراً یہاں سے چلی جاؤ نہ جانے کیوں عاصم کے لہجے کی اس سختی سے سروش کو تھراکا احساس کیوں ہوا۔ اس نے غیر ارادی غور پر سر اٹھا کر حیرانہ کی طرف دیکھا وہ غصے سے پاگل ہو رہی تھی اس نے دانت ٹیس کر دونوں کی طرف دیکھا۔ ”میں سمجھ لوں گی تم دونوں سے“ کھٹاک سے دروازہ دھکیلتی وہ باہر نکل گئی۔

”عجیب اتنی لڑکی ہے۔“ عاصم نے سر جھٹک کر بیسے خود سے کہا پھر اک گہرا سانس لے کر اس سے بولا۔ ”یہ آفت کی پرکالہ کہیں آپ کو ملی میں پہلے عجیب شگوفہ چھوڑا ہے انہوں نے۔“

سروش جھنجھلائی۔ وہ کس اطمینان سے باتیں کر رہا تھا اور وہ اس کی وجہ سے مصیبت میں پھنسی تھی۔ اسے پھر عاصم پر غصہ آ گیا کبھی سے بولی۔ ”مٹی ہاں مجھے ان سے شرف ملاقات حاصل ہو چکا ہے یہ انہی کی عنایت ہے کہ میں جگہ جگہ ملازمت کیلئے خوار ہو رہی ہوں اور یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ عاصم صاحب صرف آپ کی وجہ سے وہ لڑکی میری دشمن بنی ہے۔ وہ جذباتی سی ہوگئی۔ وہ آپ کی منگیتر ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور بقول اس کے میں آپ کے ساتھ طرٹ کرتی ہوں۔ اس کی آواز بھرا گئی۔

”ادوا عاصم نے سر پکڑ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس قدر گر سکتی ہے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔“ وہ طنز یہ لہجے میں بولی۔ ”یہ بھی تمہیں انٹرویو دے رہی ہیں نا۔“

سروش کو اس کا اعزاز سخت ناگوار گزارا لیکن وہ پھر بھی خود پر قابو پائے رہی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ عاصم اسے کیا جواب دیتا ہے۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اس کے آنے سے پریشان ہوا ہے۔ اس کے چہرے پر غصے کی صاف جھلک تھی۔ وہ کبھی سے اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”آپ کیا کہنا چاہتی ہیں میرا کیا مطلب ہے آپ کا؟“

وہ ذک عجیب سی لمبی ہنس کر بولی۔ ”میں جو کہنا چاہتی ہوں وہ تم جانتے ہو۔“

”ہلیز میرا! میں کوئی تنگی پیدا نہیں کرنا چاہتا بہتر ہوگا کہ تم اس وقت چلی جاؤ۔“

عاصم۔ پاٹ لہجے میں بولا۔ تو سروش کو یقین ہو گیا کہ وہ اسی کی منگیتر ہے۔ وہ ہید کھل جانے کے خیال سے اسے کسی نہ کسی طرح ٹالنا چاہتا ہے۔ اسے میرا بالکل بے قصور معلوم ہوئی۔ وہ ایک گھست کھائی ہوئی لڑکی تھی وہ اپنی محبت کیلئے کچھ بھی کر سکتی تھی۔

اب خاموش رہتا حال تھا۔ وہ بات صاف کر لینا چاہتی تھی۔ اسی لئے اس نے سنجیدگی سے کہا تاکہ عاصم بھی جان لے حیرانہ صاحب! میں جا رہی ہوں آپ بڑے اطمینان سے اپنے منگیتر سے بات کیجئے۔ منگیتر کا لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا تھا۔

”میرا کا چہرہ متغیر سا ہو گیا تھا۔ عاصم نے ایک دم اٹھ کر کہا ٹھہر جائیے سروش۔“

کس نے کہا ہے آپ سے کہ یہ میری منگیتر ہے کس نے بتایا ہے آپ کو؟“

سروش نے بے یقینی سے دونوں کی طرف دیکھا حیرانہ نے جلدی سے کہا عاصم جب ایسا ہوتا ہی ہے تو کہہ دینے میں کیا ہرج ہے تم تو یونہی غصے میں آ رہے ہو

لیکن بات جتنی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ امید کی کرن اندھروں میں کہیں نظر نہیں آتی تھی۔ سارے راتے جیسے بند ہو گئے تھے۔ ساری راہیں ناکامی کی بندگی میں جا کر ختم ہوتی تھیں کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہوگا۔

عاصم کی فرم کی طرف سے اس کی تقرری کا لیٹر آیا تھا لیکن وہ نہیں گئی۔ دو مہینے خورخورد ہو گئی تھی۔ وہ اس کے اندھے انتقام کا نشانہ نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ عاصم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دو تین ٹیوشنز اور لے لے تاکہ گھر میں کچھ تو سہولت ہو۔ اسی لئے وہ آج یہاں آئی تھی اور اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم کی سہاوت دیکھ دیکھ کر وقت گزار رہی تھی۔

دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے المینان کا سانس لیا۔ بھاری بھر کم سی بیگ صلیب خراماں خراماں شریف ٹارعی تھیں۔ وہ سنبھل کر خود کو ان سے بات کرنے کیلئے تیار کرنے لگی لیکن وہ بیگ صلیب جو اس وسیع ڈرائنگ روم میں بٹھکتی ہوئی داخل ہوئی تھیں کمرے کے وسط تک آ کر اچانک بجلی کی طرح لگیں اور سروش کو بازوؤں میں دبوچ لیا سروش اس اچانک افتاد سے بوجھلا گئی۔ اسے سروش کی ہنسی تو کہاں تھی۔



سروش میں بہت شرمندہ ہوں مجھے بہت افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ اس کا جہنم انتقام نہیں۔“

”مجھے کیا فائدہ اس عداوت کا۔“ سروش نے غصے سے کہا آپ کی یہ عداوت اس توہین کی صفائی نہیں کر سکتی جو اس کے ہاتھوں میری ہوئی ہے۔ مجھے اب بھی اس کے ارادے اچھے نظر نہیں آتے۔“

”آپ حق بجانب ہیں سروش؟“ عاصم نے عداوت سے کہا میں اور کچھ نہیں تو اتنا ضرور کروں گا کہ آپ کی تقرری کے کاغذات ابھی جاری کروں آپ یقین کریں آپ یہاں بالکل محفوظ رہیں گی وہ اب کچھ نہیں کر سکتیں۔“

”جی نہیں شکریہ“ اس نے عداوت سے کہا۔ ”میں کسی صورت آپ کے یہاں ملازمت نہیں کر سکتی ہوں مجھے اپنی عزت سب باتوں سے زیادہ عزیز ہے۔“

”سروش پلیز! آپ ٹھنڈے دل سے سوچئے۔“

آپ کو ضرورت ہے۔“ وہ بھجوتے کے انداز میں بولا۔

رہنے دیجئے آپ اپنی ہمدردیاں اور آئندہ مجھ سے آپ کو کوئی تعلق نہیں ہونا چاہئے۔ میں ایک شریف خاندان کی لڑکی ہوں۔ ہمارے ہاں یہ سکیئنڈل ٹیسی کیبل نہیں زندگی اور موت کا سوال بن جاتے ہیں۔“

”سروش میری بات تو سنئے۔“ وہ متاثر ہو کر بولا لیکن وہ ان سنی کرتی ہوئی تجڑی سے باہر نکل گئی۔



اودھ پونا کھتے سے وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی بوری ہو رہی تھی۔ وہ بیگ صلیب آنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ آج اک ٹیوشن کا اشتہار دیکھ کر وہ یہاں آئی تھی۔

”اوہ..... بہت افسوس ہے۔“ نلیم نے تاسف کا اظہار کیا۔ ”لیکن..... لیکن سروش! وہ تمہارا بھتیجی ہے۔“

”وہ باہر چلا گیا تھا۔ اس نے وہیں دل لگا لیا۔ اس بات کو تو ایک زمانہ بیت گیا ہے۔“

پھر اسے سے وقت میں یہ کیا کچھ ہو گیا ہے۔“ نلیم کی آواز رنمکھ گئی۔

”نندہ دن رہے ہیں، نہ راتیں۔ سبھی کچھ بدل گیا۔ میں۔ میں نہیں رہی۔ کچھ اور بن گئی ہوں۔“ وہ کتنی ہی دیر باتوں میں لگی رہیں۔ دنیا جہاں کی باتیں۔ دکھ سکھ کی باتیں۔ سروش کو گہری اپنائیت کا احساس ہوا۔ اس کا دل اطمینان سے بھر گیا۔ اس کی روح کی بے چینی کم ہو گئی۔ نلیم کے ہونے سے اسے یوں لگا جیسے وہ برسوں بعد کسی سے اپنے دل کی بات کہہ پائی ہے۔

اس نے گھڑی دیکھی تو گھبرائی۔ دوسری ٹیوشن پر جانے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس نے چلنے کا ارادہ کیا تو اسے یاد آیا کہ اس نے نلیم سے عدنان کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں تھا۔ اپنی اس بھول پر وہ پشیمان ہی ہو کر بولی۔ ”ارے دیکھو نلیم۔ کتنی بری بات ہے۔ باتوں میں ایسے لگے کہ عدنان بھائی کے بارے میں پوچھا ہی نہیں ان کی سزاؤ۔ وہ کیسے ہیں۔“

”نلیم ٹھیکسا کر ہنس پڑی۔ اوہ حضرت کی بھلی پوچھی۔“

”کیوں۔ خبریت!!! سروش نے پوچھا۔“

”آج ہی اس سے لڑائی ہوئی ہے اور معرکے کی۔ وہ بھر ہنس پڑی۔“

”ارے۔ اچھا۔ ابھی تک وہی سلسلہ ہے۔ سروش نے حیرت سے کہا۔“

”وہی سلسلہ ہے۔ کبھی ٹوٹا ہی نہیں۔ اور آج تو لڑائی ہوئی ہے بڑے معرکے کی۔ بیکسا جھٹکا گیا ہے آفس۔“

سروش چونک گئی۔ اس بھاری بھر کم وجود کو تو شاید پہچاننے میں اسے دیر لگتی۔ لیکن یہ آواز اور انداز نلیم کے سوا کسی اور کے نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امانڈ آئے اور وہ اس کے گلے سے لگ گئی۔ یہ اچانک ملاقات اتنی پر لطف اور سستی خیر تھی کہ دونوں اس کی سرشاری بڑی دیر تک اپنے رگ و پے میں محسوس کرتی رہیں۔ دونوں جلد جلد باتیں کرنے کی دمن میں ایک دوسرے کی باتیں کاٹ کاٹ کر بول رہی تھیں اسنے سالوں کی باتیں وہ چند لمحوں میں ایک دوسرے کو بتا دینا چاہتی تھیں۔

”نلیم نے خوشی سے چمکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن سروش تجھے کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں۔ میں جب سے وہاں آئی ہوں تیرے بارے میں سوچتی رہتی تھی ایک دو پرانی کلاس ٹیلوز سے معلوم بھی کیا لیکن کچھ پتہ نہیں چل سکا۔“

”کچھ بتا دوں۔“ سروش نے ہونٹ کاٹ کر کہا۔

”بالکل کچھ۔“ نلیم نے دہرایا۔

”میں یہاں ٹیوشن کا پتہ کرنے آئی تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ تمہیں بھی کیلئے ٹیوشن کی ضرورت ہے۔“ نلیم سادگی سے ہو گئی۔ پھر قدرے پریشان ہو کر بولی۔ لیکن تجھے۔ تجھے اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”ضرورت ہے نلیم۔ اب حالات وہ نہیں رہے۔ ابو کا انتقال ہو گیا ہے گھر کی ساری ذمہ داری اب مجھ پر ہے۔“ سروش نے بتایا۔

”پھر.....“ سروش نے ہنس کر کہا۔

”پھر یہ کہ ظہور۔ ذرا فون کرتے ہیں اسے۔“ نیلم نے فہرٹا کر ریسیور کان سے اٹکایا۔ اور بولی ”ہیلو۔ میں سز عدنان بولی رہی ہوں۔“ پھر ریسیور پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”کہہ رہا ہے میں کسی سز عدنان کو نہیں جانتا پھر ریسیور میں بولی۔ ”بہت ضروری کام ہے۔ جلدی سے آ جاؤ۔ نہیں آؤ گے تو پچھتاؤ گے۔“ اس نے ریسیور رکھ دیا اور سروش سے بولی۔ شٹ اپ شٹ اپ سٹیج رہا ہے۔“

پھر اس کی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ دھڑ سے دروازہ بند ہوا اور عدنان کھٹ پٹ کرتا اندر آیا۔

”کیا بک بک لگا رکھی تھی فون پر۔ ابھی کچھ کسر باقی رہ گئی تھی۔“ نیلم نے اسے ٹوکا۔ ذرا تیز سے بات کرو سبڑ۔ گھر میں کسی آئے گئے کا لحاظ کر لیا کرو۔“ نیلم نے اسے ٹوکا۔ ”کون آیا ہے؟؟“ وہ جھلایا۔

”کچھ تمہیں نظر بھی آئے۔ نیلم نے ایک جانب کھڑی ہوئی سروش کی جانب اشارہ کیا۔

عدنان نے اس کی طرف دیکھا اور پہچان کر چلایا۔ ”ارے۔ آپ ہیں سروش۔ وہ دو ہی قدموں میں قریب آ گیا۔“ یقین نہیں آ رہا کہ آپ واقعی سروش ہیں۔ جب سے یہاں آئے ہیں یہ نیلم کی بیٹی آپ کو ہی تلاش کرتی رہی ہے۔“ عدنان نے سرت سے اس کے شانے چھتپھائے۔ ہم دونوں آپ کو بہت یاد کیا کرتے تھے۔ آپ بتائیے۔ کبھی آپ کو بھی ہمارا خیال آیا۔ کبھی آپ نے بھی ہمیں یاد کیا۔“

اس کے اس تپاک سے تازہ کھل اٹھی۔ وہ نیلم کی بیٹی سروش کی کوئی خاطر تواضع بھی کی ہے یا نہیں۔“

”شکر یہ عدنان بھائی! اب تو میں چلوں گی۔ مجھے آئے ہوئے کافی دیر ہو گئی ہے۔ سروش چلنے کیلئے اٹھی کچھ دیر تو بیٹھتیں آپ۔“ وہ بولا۔

”میں انشاء اللہ! پھر آؤں گی۔ اس وقت تو اتنا ہی بہت ہے کہ آپ دونوں خوش ہیں۔ میرے پھر آنے تک کوئی لڑائی نہ کیجئے گا۔ سروش نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ دونوں بھی اس کی ہنسی میں شامل ہو گئے۔



ایسے دیگرگوں حالات کا اچانک بدل جانا بڑے اچھے کی بات ہے۔ عدنان نے اپنے آفس میں اس کیلئے ایک جگہ نکال لی تھی۔ وہ اسے بہنوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ مالی پریشانیوں میں کافی حد تک کمی ہو گئی تھی۔ بے سکوئی طمانیت میں بدل گئی تھی۔ مشکلات کے دن اب کم رو گئے تھے۔ رلیجہ کا رزلٹ آنے والا تھا۔ عدنان نے یقین دلایا تھا کہ اس کیلئے ملازمت کا کوئی انتظام ہو جائے گا۔

نیلم کی بیٹی کنول کی سروش سے بڑی دوستی ہو گئی تھی۔ وہ کبھی مصروفیت کے سبب ان کے گھر نہ جاسکتی تو وہ فون پر شکایت کرتی۔ وہ اس کی بھولی مصوم باتوں میں کھو کر زندگی کی تلخیاں بھول جاتی۔ اس نے اپنی سالگرہ پر بڑے اصرار سے بلایا تھا۔ زیادہ تر تو اس کے ہم عمر بچے ہی مدعو تھے لیکن نیلم نے اس سے کہا تھا کہ وہ آ کر ذرا تیاری کروادے۔

وہ کنول کیلئے پیارا سا تھو لیکر ان کے یہاں پہنچی۔ تو کنول یہاں وہاں چپکتی پھر رہی تھی۔ عدنان حڑ سے را کر پر جمول رہا تھا اور وقفے وقفے سے نیلم کو جھک بھی

نیلیم نے تعارف کرانا چاہا۔ ”یہ میری بہت پیاری دوست ہے۔ بلکہ فیملی ممبر ہی سمجھے۔“

”بہت خوشی ہوئی آپ سے ملکر۔“ وہ بالکل انجان بن کر بولا۔

سروش بمشکل مسکرائی۔ وہ اسے زہر لگ رہا تھا۔ اسی لئے وہ کنول کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹ گئی۔ چائے وغیرہ کے دوران عام، عدنان سے باتیں کرتا رہا۔ پھر دونوں اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ سروش نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ اس کی نگاہوں کو وقفے وقفے سے دیکھتے ہوئے محسوس کر رہی تھی۔ شام بڑی مصروف تھی۔ بچوں کو مختلف کھیل کھلاتے کھلاتے وہ خود بھی کچھ تھک سی گئی تھی۔ پھر بچوں کی آیائیں اور ڈراما سیرا نہیں لینے کیلئے آگئے۔ سروش نے ان میں تھے بانٹے اور انہیں گیٹ تک چھوڑ کر آئی۔

کنول نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ اچھلتی ہوئی اسے واپس ہال میں لے آئی۔ سروش قالمین پر ہی دیوار سے ٹک لگا کر بیٹھ گئی۔ کنول میز پر سے تھے اٹھا اٹھا کر اس کے پاس رکھنے لگی۔ اور خوشی سے کھلکھلاتے ہوئے بولی۔ ”آئی۔ آئی۔ آئی۔ اب تھے کھوکھو دیکھتے ہیں۔“

”ابھی ٹھہر و کنول اما کو آ لینے دو۔ سروش نے اسے ہلنے کو کہا۔

”نہیں آئی! ہم تو ابھی دیکھیں گے۔“ وہ ضد کرنے لگی۔

ورہ ازے میں سے عام نے جھانکا۔ کنول بھاگی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے آئی جہاں سروش قالمین پر ٹکے پاؤں بے تکلفی سے بیٹھی بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے کاسنی دوپٹہ درست کرتے ہوئے اپنے بیڑ سمیت لئے اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا لہرا گیا۔

کر رہا تھا۔ نیلیم نوکروں کے ساتھ ملکر ہال کو رنگین سجائوں اور غباروں سے سجاتی ہوئی بانپ رہی تھی سروش کو دیکھا تو سبھی کھل اٹھے۔ کنول اس سے لپٹ گئی۔ نیلیم بے دم ہو کر صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔

”لو۔ اب یہ کھیزا جی سنبھالو۔ میں تو صبح سے ایک ٹانگ پر کھڑی ہوں۔ اور

انہیں دیکھو نواب صاحب کو ذرا بھی جو ہاتھ چر ہلایا ہو۔“

سروش نے نوکروں کے ساتھ مل کر جلدی جلدی کام نپایا۔ جب تک نیلیم نے کنول کو تیار کروا دیا۔ مہمانوں کے آنے تک سب تیاری مکمل تھی۔ کنول کھمرے ہوئے گلابی فراک میں تھلی سی لگ رہی تھی۔ تالیوں کے شور میں کیک کا آگینا۔ نیلیم اور عدنان نے اس کے ساتھ کیک کاٹ۔ وہ چھوٹا سا ٹھوکرا کاٹ کر سروش کی طرف لپکی۔ ”سب سے پہلے آئی۔“ اس نے چپک کر کہا۔

سروش نے جھک کر منہ کھولا۔ کنول نے کیک اس کے منہ میں رکھا اور اس کے رخسار پر پیار کر لیا۔ اسی وقت کسی کی آواز سنائی دی۔ پتی برتھ ڈے نوڈلز بے بی کنول۔ پتی برتھ ڈے ٹو بیک لیڈی۔“ سب نے پلٹ کر دیکھا سروش کچھ الجھی۔ کچھ پریشان ہوئی۔ کنول اٹکل آگئے۔ اٹکل آگئے کتنی ہوئی اس کی طرف لپکی۔ اس نے جھک کر اسے گود میں اٹھالیا اور میز کے قریب آ کر بولا۔ ”آداب بھائی! مجھے تو آپ نے خبری نہیں کی اور اب جو کنول اپنا تھوڑا مجھ سے مانگے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔“

کنول تھکی۔ ”اما۔ آپ نے اٹکل کو کیوں نہیں بتایا تھا؟“

”مجھے نہیں پتہ تھا کہ تمہارے اٹکل ننھے سے بچے ہیں۔ نیلیم نے فس کر کہا۔

”خیر ننھے بچوں کے علاوہ یہاں کافی بڑے بڑے بچے بھی نظر آ رہے ہیں۔“

عام نے سروش کی جانب دیکھ کر شرارت سے کہا۔

سے جہاں عام اس کے مقابل بیٹھا تھا۔

نیلیم نے بھی اس کی بیزاری کو محسوس کیا۔ لیکن وہ اسے تھکاوٹ پر محمول کر رہی تھی۔ جیسے نیسے کھانا فتم ہوا سروش نے کافی بھی نہیں پی۔ اور گھر چلنے کیلئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر یہ دیکھ کر وہ سخت پریشان ہوئی کہ عام بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ گیا اور اس نے بڑی بے تکلفی سے اسے گھر تک چھوڑنے کی پابلیکیشن کر دی۔

عالمی عدنان کا وہ قریبی دوست تھا۔ اس لئے اس نے بھی کوئی پس و پیش نہیں کی بلکہ شکر یہ ادا کرنے لگا کہ وہ اس وقت ڈرائیونگ کے موڈ میں نہیں تھا۔ سروش عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئی۔ وہ نہ انکار کر سکتی تھی اور نہ عام کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ مگر مجبور تھی نیلیم اور عدنان دونوں انہیں گاڑی تک چھوڑنے آئے۔ سروش پچھلا دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گئی عام نے گاڑی نیلیم کے گھر سے باہر نکالی۔ اور کچھ آگے جا کر اس نے گاڑی کی رفتار کم کی اور پیچھے پلٹ کر بولا۔ سروش! آگے آ جائیے پلیز۔“

”بھیجے آپ کی ضروری باتیں سننے کا کوئی شوق نہیں۔“ سروش خشکی سے بولی۔  
 ”آپ بیکار ضد کر رہی ہیں۔ بچوں کی طرح سے۔“ وہ بولا۔ اس کے ساتھ ہی وہ گاڑی سے باہر نکلا۔ اس نے پچھلا دروازہ کھولا۔ سروش سر اسے ہی ہو کر پیچھے ہٹی۔ مگر عام نے جھک کر اس کا بازو پکڑا اور ایک بار میں ہی اسے گاڑی سے باہر نکال لیا۔ پھر اگلا دروازہ کھل کر اسے سیٹ پر دھکیلا اور دروازہ لاک کر دیا۔

سروش کیلئے یہ سب غیر متوقع اور ناقابل برداشت تھا۔ وہ فوراً ہی دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ اور اس کی جانب دیکھ کر شہرے سے لہجے میں بولا۔

”مجھے اپنی اس حرکت پر عذامت ہے۔ لیکن یہ ناگزیر تھی۔“

کنول نے بچوں کے سے اکھڑنے سے عام کا ہاتھ کھینچا۔ ”انکل! انکل! بیٹھے۔ ہم سارے تھکے دیکھتے ہیں۔“

”اپنی آئی! اسے پوچھو۔ ہم بیٹھ جائیں۔“ وہ کھڑے کھڑے بولا۔  
 کنول اس کا ہاتھ چھوڑ کر سروش کے شانے پر جھول گئی۔ ”آئی! آئی! انکل بیٹھ جائیں۔“

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“ نازش نے اسے علیحدہ کرتے ہوئے آہستگی سے کہا کہ کنول نہ سن سکے۔

وہ ہنس پڑا۔ ”آپ کو دلچسپی نہ ہو۔ مجھے تو ہے۔ وہ وہیں قائلین پر بے تکلفی سے بیٹھ گیا۔ سروش نے تیوری چاھا کر اس کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولا اس طرح کیوں گھور کر دیکھ رہی ہیں مجھے۔ میں نے ایسا کیا تصور کر دیا ہے۔“  
 سروش نے غصے سے دانت پیسے۔ بس آپ میرے سامنے نہ آیا کریں۔ میں..... میں۔“ کنول کے خیال سے اس نے بات ہونٹوں پر ہی روک لی۔ اور جلدی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

عام نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”اپنی بات مثل کیجئے۔ آپ کیا کہنے والی تھیں۔“  
 ”مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور تیز قدموں کے ساتھ ہال سے باہر نکل آئی۔

نیلیم اسی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بولی۔ ”چلو آؤ سروش۔ کھانا لگ گیا ہے۔“ کھانے کی میز پر عام بھی موجود تھا۔ لیکن اس کی طرف بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا۔ عدنان کے ساتھ باتوں میں ہی لگا ہوا تھا۔ سروش کو اس کی موجودگی بھلی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ جلد یہاں سے دور چلی جانا چاہتی تھی اس ماحول سے اس فضا سے۔ اس گھر

”اداکاری تو آپ کر رہی ہیں۔ لیکن آپ اتنی اچھی اداکارہ نہیں ہیں کہ اپنے دل کی اندرونی کیفیات کو چھپا سکیں۔ آخر کس نے آپ کے جذبات پر پہرے بٹھا دیئے ہیں؟ کون ہے جو آپ کو اقرار سے روکتا ہے؟ آپ زندگی کو اپنے لئے کیوں مشکل بنا رہی ہیں۔“

سروش نے رخ پھیر لیا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ یہ عام اسے کیوں مشکل میں ڈال رہا تھا۔ اس نے ہونٹ کاٹتے ہوئے پریشانی سے سوچا۔ عام نے اس کے شانے کو جبکے سے چھو کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”سروش! میں آپ کا انتظار کر سکتا ہوں۔ جب تک کہ آپ اپنی ذمہ داریوں سے سیکڑوش ہوں اور اپنے بارے میں سوچیں۔ جب آپ خود کو تھما محسوس کریں۔ جب آپ کو کسی اپنے کی ضرورت محسوس ہو تو آپ مجھے۔“

سروش نے اس کی بات کاٹی۔ ”اس توجہ کیلئے شکر یہ عام صاحب! لیکن میں اپنے فیصلے خود کرتی ہوں۔ مجھے اپنے انداز میں زندگی گزارنے کا حق ہے اور یہ حق مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔“

”اچھا۔“ وہ گراسانس لے کر بولا۔ آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں۔ لیکن یہ بھی سن لیجئے کہ آپ کچھ بھی کہہ لیں۔ جتنے بھی دعوے کر لیں۔ ایک روز تو آپ کو اقرار کرنا ہی ہے۔ یہ رایبے یہ جذبے اتنے کچے نہیں ہیں کہ بنا بھر میں مٹ جائیں۔“ اس کے انداز میں نہ جانے کیا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ دل کے متقل دروازوں پر دستک دینے لگا تھا۔ اس نے گھبرا کر سوچا۔ کہ وہ بھی عام کی طرح اسے اپنے سنہرے لفظوں کے جال میں قید کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر جیسے اس صورتحال سے بچھا چھڑانا چاہا اور تلخی سے بولی۔

سروش کو وہ اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اتنی بے بس اور مجبور تو نہیں تھی کہ وہ جو چاہے اس کے ساتھ سلوک کرے۔ اسے فریب دینا رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آنے لگے۔ اسے نصیحت کرنا محال ہو گیا۔ اس نے طیش میں اس کے کوٹ کی آستین مھمیت ڈالی اور بھرے ہوئے گھے کے ساتھ بولتی چلی گئی۔ آخر آپ نے مجھے کچھ کیا رکھا ہے۔ یہ فریب کسی اور دیجئے۔ یہ ڈرامے کہیں اور جا کر کیجئے۔

عام نے نہ اپنے کوٹ کی آستین چھڑائی اور نہ اسے کچھ کہنے سے روکا۔ وہ چپ ہوئی۔ تو وہ ظہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”سروش! دلوں کے خوبصورت جذیوں کو ڈرامہ نہیں کہتے۔ میں تو صرف آپ سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ کو تقرری کا لیٹر بھیجا گیا تھا مگر آپ نے جواب نہیں کیا۔“

”کیوں.....؟ کیا ابھی آپ کی تسلی نہیں ہوئی۔ آپ مجھے اسی لڑکی کے انتقام کا اور نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ جو خود کو آپ کی مٹھیر کہتی ہے۔ پلیز! آپ میرا بیچا چھوڑ دیں۔ آپ ان سارے خوبصورت جذیوں کو لے کر میری زندگی سے نکل جائیں۔“

”یہ تو نہیں ہو سکتا سروش! وہ اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔ پھر تھوڑا سا جھکا اور اپنا چہرہ اس کے چہرے کے برابر لایا اس نے لطفیلی سرگوشی کی۔

”سروش! میں تو آپ کے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ آپ کے ساتھ۔ صرف آپ کے ساتھ۔“ اس کی فراغ پریشانی سروش کی پیشانی کے ساتھ ہلکے سے چھو گئی۔

سروش جلدی سے پیچھے ہٹ گئی۔ اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”عام صاحب! مجھے آپ کی ان اداکاریوں میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور میں۔“

”یہ اداکاری نہیں ہے سروش!“ عام نے پر زور لہجے میں اس کی بات کاٹ

عامم سے پھر کہیں سامنا نہیں ہوا۔ وہ غیر ارادی طور پر اس کی جانب سے کسی پیغام کا انتظار کرتی رہی۔ کئی بار اس کی آمد کا گمان ہوا۔ کئی بار اس کے فون کا دھوکہ ہوا۔ لیکن وہ تو کہیں نہیں تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی میں کبھی اس کا گزر نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ بھی اس کا خیال ذہن سے جھٹکتے میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے دل پتھر کر لیا تھا۔ خود بے حس بن گئی تھی۔ اس نے اپنی سوچوں کو راہ دکھا دی تھی۔ اپنے خیالات کو جھٹکنے نہیں دیا۔ لیکن اٹھانے میں کبھی کبھی پتھر میں اک گداز سا پیدا ہو جاتا۔ احساسات اک ظلمت بن جاتے، سوچیں کہکشاں کے رستے ڈھونڈنے لگتیں۔ کچھ دیر کیلئے وہ کھوی جاتی۔ لیکن پھر حقیقت کے پتے ہوئے صحرا میں نکل آتی جس میں مرد ہوا کا کوئی خوشگوار جھونکا نہیں تھا۔

زندگی ویسی ہی مصروف اور معمول کے مطابق تھی۔ دفتر سے کام کر کے وہ گھر کی محبت بھری فضا میں آ جاتی تو اسے تازگی اور قلبیگی کا احساس ہوتا۔ یہاں وہ سارے ٹھکرات سے آزاد ہو کر اطمینان سے ہنس کھیل سکتی تھی۔ گرجوشی محبت کی اس فضا میں کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ یہاں ساری محرومیاں، ساری اداسیاں، دور ہٹ جاتی تھیں۔ محبت، الفت و پیار کے سارے اپنا بیت بھرے رشتے اسے یوں آغوش میں لے لیتے کہ وہ سب سے بے نیاز ہو جاتی۔ ایک روز اچانک۔ نیلم کے یہاں گئی تو دیکھا دونوں ابھی ابھی کھنکھانے باہر سے آئے ہیں۔ نیلم اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ اور حسب عادت گلہ

”عامم صاحب یہ بیکار ہاتھ لے کر کیا آپ سڑک پر کھڑے ہو گئے ہیں۔ مجھے گھر پہنچا دیے اور جائے اپنا راستہ لیجئے۔“  
وہ چند لمحوں خاموش رہا۔ پھر نہ جانے کیوں ہنس پڑا۔ اور لہا سانس لے کر بولا۔

”تو آپ کو گھر جانا ہے۔ آئیے آپ کو پہنچا دیتے ہیں۔“

اس نے گاڑی کی رفتار تیز کی اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے گھر تک آ گیا۔ دونوں کے درمیان جیسے خاموشی اور اجنبیت کی دیوار سی حائل ہو گئی تھی۔ سردش دروازہ کھول کر اترنے لگی۔ تو اس نے بڑی شانستگی سے اسے شب بخیر کہا اور گاڑی بڑھالے گیا۔



”تو اور کیا دیکھا نہیں تھا کس طرح ہنس رہا تھا۔ کہہ رہا تھا بھائی آپ تو کچھ کچھ نیچی بھی ہیں۔“

وہ دونوں آپس میں الجھے ہوئے تھے اور سروش کے ذہن میں ایک ہی بات چکر رہی تھی۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ وہ اسی کی وجہ سے گیا ہے۔ اس کے دل و دماغ پر اک عجیب سی حزن و ملال کی کیفیت چھا رہی تھی۔ یوں جیسے ہوا نسکی میں کچھ کھو گیا ہو۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیشہ کیلئے زندگی سے نکل گیا ہے۔ دنیا بڑی اجاڑ اور دیران سی معلوم ہو رہی تھی۔ نہ جانے کیوں تھا چاہ رہا تھا کہ سب سے چھپ کر، سب سے الگ تھلگ تنہا بیٹھی منہ ڈھانپ کر اس قدر روئے کہ احساس مٹ جائے۔

وہ ساکت سی گم سم بیٹھی دل کی گہرائیوں میں اٹھنے والی ہوک سن رہی تھی۔ کوئی بار بار اس سے کہتا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں آئے گا۔ اچانک ٹیلیم نے اس کی طرف دیکھا اور اس کا شانہ ہلا کر بولی۔ ”اے سروش! تم کیا سوچ رہی ہو؟ اس طرح کیوں گم سم بیٹھی ہو؟“ سروش نے سر جھٹک کر اس کی طرف دیکھا اور پشیمانی سے بال ہٹاتے ہوئے بولی۔ ”میں کچھ بھی تو نہیں۔“



اس روز اس نے جی بھر کے سوگ منایا پھر شکستہ دل کی کرچی کرچی جواز کر اپنے وجود کے ٹکڑوں کو سمیت کر وہ پرسکون ہو گئی۔ ایسی پرسکون کہ بے سکونی دل میں کب کب جاتی تھی۔ زندگی میں اک ٹھہراؤ، سا آ گیا تھا۔ جس میں چھپی لچل وجود کو بلا دیتی تھی۔ اک جمود سا سارے وجود پر چھایا تھا۔ جو روح کی پڑمروگی بن گیا تھا۔ دل کی دنیا لٹا دینی من کو مار لینا اتنا سہل نہیں تھا۔ بظاہر وہ اپنے آپ میں سگن تھی گھر کی چھوٹی سی جنت میں کھوئی ہوئی سی۔ لیکن نہ جانے دل میں کا ہے کی غلط تھی۔ اک

کرنے لگی کہ وہ بہت دنوں بعد آئی ہے۔ کنول بھی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ عدنان نے قریب آ کر خوش طبعی سے کہا۔ ”کیوں سروش میں کونسا ایکشن دوں کہ تمہیں پتہ چل جائے کہ میں بھی تمہارے آنے سے بہت خوش ہوں۔“

سروش کو ہنسی آ گئی۔ ”نہیں نہیں عدنان بھائی بس بہت شکر یہ مجھے تو یونہی پتہ ہے۔“

ٹیلیم جسم سے ٹالین پر بیٹھ گئی۔ ”بھی بہت یور ہوئے۔ آج تو پورا ایک گھنٹہ فلاٹ لیٹ تھی۔“

”کسی کو سی آف کرنے گئے تھے کیا؟“ سروش نے یونہی پوچھا۔

”ہاں گئے تھے۔ ان کے دوست کو سی آف کرنے۔ یہ عدنان صاحب تو حاکم کے ساتھ کھڑے منہ بسور رہے تھے اور میں خواخوہ پور ہوتی رہی۔“ ٹیلیم نے برا سامنے بتایا۔

سروش حاکم کے نام پر چنگی۔ اسے شک ہوا کہ کہیں حاکم تو نہیں چلا گیا۔ وہ خود کو تصدیق کرنے سے نہ روک سکی۔ اس نے بظاہر عام سے لہجے میں لاشعری سے پوچھا۔ ”کیا حاکم کہیں باہر گئے ہیں؟“

”ہاں وہی۔“ ٹیلیم نے جواب دیا اور عدنان سے بولی۔ عدنان مجھے تو کوئی اور ہی چکر لگتا ہے۔ دیکھا تھا منہ پر کیسے بارہ بج رہے تھے۔ میں نے پوچھا وہ ابھی کب تک ہے تو کہتا ہے بھائی دعا کیجئے کہ کوئی صورت ایسی نکل آئے کہ جلدی آ جاؤں۔“

ٹیلیم نے اس کی نقل اتاری۔

تم نے بھی تو سب کے سامنے لٹا نہیں کیا عدنان نے جمل کر کہا۔ ”وہیں پوچھنے بیٹھ گئی تھیں کہ کہیں کوئی دل دل کا معاملہ تو نہیں۔“ اب کے عدنان نے اس کی نقل اتاری۔

انکار کر دیتی ہے۔ اس کی ماں کو طعنے ملتے تھے کہ وہ بیٹی کی کمالی کھا رہی ہے۔ امی کی آنکھوں میں امنڈتی بے بسی، ان کے چہرے کی دیرانی اور تشویش دیکھتی تو اس کا سن سگ اٹھتا۔ کیا وہ اتنی بری ہے کہ اپنی ماں کیلئے عی الجھن بن گئی ہے۔ اسے ساری دنیا سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ وہ کس طرح زندگی گزارے کہ لوگ خاموش ہو جائیں۔ اس کے ہارے میں کچھ نہ کہیں اس کی ماں کو دن رات عذاب نہ دیں وقت اس کے دامن میں لہو لہو پھول اور کانٹے بھرتا اسے چھو چھو کر گزارتا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ تو اک طویل راستے طے کر آئی تھی۔ تختیوں کے دن کٹ گئے تھے۔ تھوڑے سے کانٹے رو گئے تھے۔ وہ بھی فہم کر چن لیتی تو بہاریں اور شادمانیاں اس کا مقدر تھیں۔ راجہ قانون پڑھ رہا تھا۔ نازش بی اے کر چکی تھی اور جینٹلمینز میں آ گیا تھا۔ وہ کتنی مسرور تھی۔ اس نے دنیا کی پروا کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے جو چاہا تھا۔ وہ پانے کو تھی۔



تا قابل فہم نہیں اس نے اپنے گرد ایک مضبوط حصار کھینچ لیا تھا۔ اپنے اوپر خود داری کا ایک خول سا چڑھا لیا تھا۔ وہ اک مٹھین کی طرح کام کرتی تھی۔ اس نے کبھی سن میں جھانک کر نہیں دیکھا، کبھی دل کی گہرائیوں میں نگاہ نہیں ڈالی، کبھی بھولے سے بھی روح پہ چھائی پڑ مروگی کا سبب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ خود کو یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ اسے کوئی غم نہیں۔ اس کے ساتھ کوئی بچھتا وہ نہیں۔ اسے کچھ نہیں چاہئے۔ اسے کسی کی آرزو نہیں۔

وہ خود کو بہت مصروف رکھتی تھی اس نے مقاصد کو سامنے رکھ لیا تھا۔ اس نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ اپنے بھرے پرے گھر کو دیکھ کر نہال ہی ہو جاتی تھی۔ جس میں خوشیاں اس کے دم سے تھیں۔ جسے اس نے زندگی کے رنگین ماہ و سال سے سہایا تھا۔ وہ یہ سوچ کر جی اٹھتی تھی کہ ابھی اسے بہت کچھ کرنا ہے۔ اسے اپنے بہن بھائیوں کو ان کی منزل پر پہنچانا ہے۔ اسے اس گھر کو نئے رکھنا ہے۔ وہ خاموشی سے اپنی راہ پر چلی جاتی تھی۔ لیکن لوگ راستے میں آ جاتے تھے۔ وہ ابھی تک عامر کے ساتھ ٹوٹنے والی مٹھنی نہیں بھولی تھی۔ ملنے جلنے والے، عزیز رشتہ دار ہمدردی جتاتے۔ اسے دیکھ کر ٹھنڈی آہیں بھرتے۔ امی کو اس کی شادی کی فکر کرنے کو کہہ جاتا۔ پھر اس کی بڑھتی ہوئی عمر پر تشویش کا اظہار کیا جاتا۔ پھر پورے غلوں کے ساتھ اسے مشورہ دیا جاتا کہ وہ جلد اپنی فکر کرے۔ ورنہ بعد میں کوئی نہیں پوچھے گا۔ اکثر اس کیلئے کسی اوجیز عمر، کئی بچوں کے باپ کا رشتہ بھولا جاتا اور اس کے انکار پر کئی طرح کی باتیں بنتیں۔

کوئی نہیں سوچتا تھا کہ اس نے کتنی قربانی دی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے مراہوں بھرے دن لٹا کر اس گھر میں بہا لائی ہے۔ وہ اپنا آپ سچ کر اپنے بہن بھائیوں کی زندگی بنا رہی ہے۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ مردوں کے دفتر میں کام کرتی ہے اسی لئے شادی کرنے کا نام نہیں لیتی۔ اس کی آنکھیں کسی اونچی جگہ لگی ہیں۔ جسکی ہر رشتے کیلئے

ہے۔ دیکھ لو اس وقت آفس سے اٹھ کر سیدھی تمہاری طرف ہی آئی ہوں۔" سروش نے اسے مناتے ہوئے کہا صدف مسکرائی۔ "پٹے جتا ب مان لیتے ہیں کہ آپ بہت معروف ہیں۔"

"اجہاتم اپنا پینا تو دکھاؤ نا۔" سروش نے اشتیاق سے کہا۔

"اتنے دنوں بعد آئی ہیں تو کسی بے مبری بنا رہی ہیں۔ ابھی آیا لے کر گئی ہے اسے نہلانے۔" صدف نے اسے ہلکی سی چپت لگا کر کہا۔

کچھ دیر دونوں ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔ آیا اس کے بیٹے کو لے کر آئی تو سروش نے اسے گود میں لے لیا۔ دو ہمدیدہ سا بہت گورا گورا بچہ تھا۔ بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں بالکل صدف پر تھیں۔ سروش نے ہولے سے اس کی آنکھوں کے گرد ہاتھ رکھا تو اس نے مصحوم شرقی آنکھیں پوری طرح سے کھول دیں سروش کو وہ بہت پیارا لگا۔ اس نے صدف سے کہا۔ "کتنی خوبصورت آنکھیں ہیں سنے کی بالکل تم پر ہیں صدف۔"

"مجھ سے بھی ملتی ہیں۔" صدف نے ہولے سے کہا۔ "لیکن امی بتاتی ہیں کہ یہ بالکل عاصم بھائی پر ہے۔ بچپن میں ان کی آنکھیں اوز پیشانی بالکل ایسی ہی تھیں۔ صدف نے محبت سے اس کی پیشانی پر کئی دفعہ پیار کیا اور نم نم سی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "عاصم بھیا! تو ایسے گئے ہیں کہ واپس آنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ہماری تو آنکھیں ترس گئیں۔ ان کی صورت دیکھنے کو۔" اس نے آنسوؤں سے بھری آنکھوں کو زور سے بھیج کر کہا۔

سروش کو نہ جانے کیوں احساس جرم سا ہوا۔ سوگوار صدف اس کے سامنے مہور بیٹھی تھی۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس ہنسی ہوئی لڑکی کو سوگوار کرنے والی وہ خود ہے۔ اس نے سر جھٹک کر خود کو سنبھالا اور بڑے لگاؤ سے صدف سے کہنے لگی۔ "لو تم دل تھوڑا کیوں کرتی ہو صدف تم انہیں خط لکھو تا تمہارے بیٹے کا سنس کے تو ضرور آئیں

اک عرصے بعد صدف کا فون آیا تھا۔ اس نے بڑے گلے شکوے کئے تھے کہ وہ اسے بھول گئی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے یہاں بیٹا ہوا ہے۔ اسے کبھی وقت ہو تو ملنے آجائے۔

سروش نے ریسیور رکھا اور کچھ دیر سوچتی رہی۔ صدف کے ساتھ نہ جانے کیوں عاصم کا خیال آ گیا تھا۔ نہ معلوم وہ کہاں تھا؟ اس کے ساتھ تو جیسے ہر رابطہ ختم ہو گیا تھا۔ پتہ ہی نہیں چلا تھا کہ وہ واپس بھی آیا ہے یا نہیں۔ اتنا عرصہ اس کے بارے میں جاننے کا کچھ اشتیاق نہیں تھا۔ لیکن اب صدف نے فون کیا تھا۔ تو عاصم کے بارے میں جاننے کی خواہش بڑی شدت سے جاگ اٹھی تھی۔ وہ اس کے بارے میں جانتا چاہتی تھی۔ اس کے بارے میں سنتا چاہتی تھی۔ دل کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی سراٹھا رہا تھا۔ کہیں اس نے شاہی تو نہیں کر لی۔

آفس سے اٹھ کر وہ گھر جانے کے بجائے صدف کی طرف ہی چل پڑی۔ اس نے محبت سے گلے لگالیا۔ اس کے گال پر پیار کی اور چند لمبے اس کا چہرہ نگتی رہی سروش کو اس کی نگاہیں عجیب ترسی ہوئی سی معلوم ہوئیں۔ اس نے توجہ ہٹانے کو جلدی سے کہا۔ "ہاں صدف اپنا پینا تو دکھاؤ نا۔" اس نے برا سامنہ بتایا۔ "ہاں جی آپ کو کیا ہم سے اور ہمارے بیٹے سے کبھی جو ملنے کا خیال آیا ہو ہم ہی بلائیں تو جائیں۔"

"ارے نہیں صدف۔ خطا کیوں ہوتی ہو۔ کچھ زندگی معروف ہی بہت ہوگی

ہو۔“

عاصم بھائی نے یہ بات مجھ سے چھپائی تھی۔ لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ آپ کو پسند کرنے لگے ہیں۔“ وہ بڑے دھوق سے کہہ رہی تھی۔ سروش شہینا گئی۔  
 ”تمہارا ہے نا۔“ ہماری کزن دو اک روز ان سے آپ کے متعلق کچھ کہہ رہی تھی۔ شاید کسی سکیٹل کا تذکرہ تھا۔ سچ کا دروازہ کھلا تھا۔ آواز صاف آرہی تھی۔ آپ کا نام بار بار آیا تو میں نے غور سے سنا۔“

سروش نے ہونٹ دانتوں تلے دہالیا۔ نہیں..... نہیں..... نہیں تو ایسی تو کوئی بات نہیں ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ کوئی نہیں۔“ وہ اسے قائل کرنے کو نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ لیکن اس کے انداز میں زور نہیں تھا۔  
 صدف نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ سروش سروش انکارت کیجئے پلیز! کیا آپ کے دل میں ان کیلئے ذرا سی بھی جگہ نہیں۔“

سروش یوں چونکی جیسے خواب کی حالت میں ہو۔

ہولے سے بولی۔ صدف میں نے تو ہمیشہ ان کی عزت کی ہے۔ اس لئے کہ وہ تمہارے بھائی ہیں۔ صدف صدف تم یقین کرو ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس نے بڑی مشکل سے الفاظ اگلے۔ وہ..... وہ اک معمولی لڑکی کیلئے سب کچھ تو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں کوئی کام ہوگا۔ جو ظہر گئے ہیں وہ نہ اور..... کیا خبر..... وہ جھکی سی ہنسی کیا خبر انہوں نے تمہارے لئے کوئی بھالی پسند کر لی ہو۔“

صدف بدستور جمیدہ رہی۔ اس کا ہاتھ زور سے دبا کر بولی۔ ”سروش! اگر اب تک آپ کو اس جذبے کا احساس نہیں تھا۔ تو اللہ اب اس پہلو سے سوچئے۔ وہ آپ کو چاہتے ہیں۔ وہ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ سروش بھری خاطر پلیز بھری خاطر اک بار ان کیلئے سوچئے ایک بار ضرور۔“

مے۔“

”بیٹے کے حقے تو آ بھی چکے۔“ وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی۔ فون پر بات کرتے ہیں بتاتے کچھ نہیں، کچھ نہیں کہتے۔ وہ اتنی دیر ہم سے کبھی دور نہیں رہے۔ اس کا دلگی لہجہ سروش کے دل میں اتر گیا وہ کہہ رہی تھی۔ سروش مجھے ہتا ہے وہ خوش نہیں ہیں وہ یہاں سے گئے تھے۔ تو بہت پریشان تھے۔ بڑے اداس تھے وہ۔ ان کے دل میں کوئی بات ہے۔ وہ..... وہ..... صدف کا گھا بھر آیا۔ وہ فکرو کھل نہیں کر سکی۔ آنسو اس کے رخساروں پر بیسے گئے۔ سروش کا نپ گئی۔ وہ نام نہادی ہو گئی۔ وہ آپ ہی آپ پشیمان ہونے لگی۔ اس کے پاس تسلی کیلئے الفاظ نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھی آنسو آرہے تھے۔ بغیر کچھ کہے اس نے صدف کا سراپے شانے سے لگا لیا اور اس کے ماتم بالی سہلانے لگی۔ وہوں رو رہی تھی۔ لیکن سروش اپنے آنسوؤں کو کوئی نام نہیں دے پائی تھی۔ صدف کچھ دیر سسکیاں لیتی رہی پھر ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔

”سروش! سروش! مجھے پتہ ہے مجھے پتہ ہے ان کا دل توڑنے والی آپ ہیں۔ آپ۔ سروش کب تک رہ گئی۔ وہ یوں پلک جھپکے بنا اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے سکتہ ہو گیا ہو۔ اسے صدف سے اس کی توقع نہیں تھی۔ اس کے اندر تردید کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ پشیمان ہی ہو کر ماتھے سے پسینہ خشک کرتی ہوئی بولی۔

”نہیں صدف! انہیں بھلا میرا ان سے کیا تعلق؟ اس کا لہجہ بہت کمزور تھا۔ اس کی آواز بہت دبی تھی۔ یوں جیسے اپنی ہی بات پر اعتبار نہ آتا ہو۔

”سروش! مجھ سے بھی چھپاؤ گی۔“ اب صدف بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنسوؤں میں، بھیگی ہوئی مسکراہٹ میں اپنائیت اور محبت تھی۔ یوں جیسے راز داری کا یقین دلا رہی ہو۔ سروش بوکھلا گئی۔ ”چھپانے کی کوئی بات بھی

بھی آخر تمہیں کیا آفت ہے کہ سب کچھ تمہیں ہی اپنا جاننا پڑھینا ہے۔ بس بہت ہو چکا اب دوسروں کو بھی کچھ کرنے دو۔“ انہوں نے رعب بھایا۔  
 ”بس اب اپنے بارے میں سوچو سمجھیں تم۔“

بس رضی بھیا! میں اسی طرح خوش ہوں۔ میں یونہی زندگی گزاروں گی۔ اسی طرح میں اپنے بہن بھائیوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ کامیاب و کامران میرے لئے بھی بہت ہے۔

”سروش! سروش! سروش! کی بچی نکلی۔ تم بہت کھمدار بنتی ہو پر ہونری احمق۔ ایسی پہاڑی زندگی کچھ یونہی نہیں گزر جاتی۔ زندگی میں کچھ اور رفتوں کی ضرورت بھی پڑتی ہے۔ زندگی میں اک خاص توازن ہے۔ سارے رشتے پاس ہوں تو زندگی، زندگی کھلاتی ہے۔ سروش میری بات سمجھو گی سے سنو وہ بڑے رساں سے بولے۔“ اگر تمہارے دل میں کوئی ہے تو مجھ سے کہو تم لے لو میں ساری بات خود پر لوں گا۔“

”سروش نے عجیب سی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ رضی بھیا! جس کو دل میں جگہ دی تھی۔ اس نے کیا صلہ دیا جو اب پھر وہی حماقت کروں۔“ وہ بظاہر تسخیر سے کہہ رہی تھی۔ لیکن شکستہ دل کا درد آنکھوں سے جمنا کتنا تھا۔

رضی بھیا نے اندر دگی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تمہیں سروش نہیں سارے لوگ ایک جیسے تو نہیں ہوتے۔ ہر بات کا انجام ہمیشہ ایک سا نہیں ہوتا۔ اس نامعقول

”یہ تو ہے ہی احمق۔ اس کی جو بات ہے حماقت سے بھری ہے۔“

”پتہ نہیں آپ کو ہر بات کی کچھ بہت دیر سے کیوں آتی ہے بس۔“

”کہہ جو دیا ہے ایک بار۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”تم کیا ہو بھئی۔“ وہ بھی جھلائے۔ ”جو کتنی ہو ٹھیک ہی کہتی ہو۔“

”اب کتنی افسوس آپ کو کھلایا جائے گا۔ کئی دسویں مرتبہ تو ہے۔“

”اور میں جو ہر روز جھک جھک کرتا ہوں وہ امانح میں کیوں نہیں آتی۔“

انہوں نے ڈپٹ کر کہا۔

رضی بھیا سے جو یہ ٹکرا ہوا ہی تھی۔ تو اس کی ہر جگہ تھی۔ کہ کسی تقریب میں ایک محترمہ نے نازش کو اپنے صاحبزادے کیلئے پسند کر لیا تھا۔ اب انہوں نے پیام بھجوا دیا تھا۔ لڑکا بھی اچھا تھا۔ سروش نے اس کر دینے پر زور دیا۔ امی نے دوسرے رشتہ داروں کو مشورے کیلئے لکھا تو رضی بھیا دندا تے ہوئے آ پیچھے۔ انہوں نے رعب کو بھی اپنا بھنوا بنا لیا۔ وہاں سب رشتہ داروں نے کھلوا بھیجا تھا۔ کہ پہلے سروش کے بارے میں سوچنا چاہئے ورنہ اس کی مرکلش جائے گی۔

سروش اس وقت سے ان کے ساتھ بحث میں الجھی تھی۔ وہ برابر اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ تو اس کی جان کو آ گئے تھے۔ پیار سے، منت سماجت سے ڈانٹ ڈپٹ کر مار دھاڑ کی دھمکیاں دے کر وہ اپنی بات منوانے کی کوشش میں تھے۔ اور کسی طرح جان نہیں چھوڑ رہے تھے۔

کس طرح ہوگی۔ سروش نے انہیں تسلی دی۔ ”آپ تو خواہ مخواہ ہی پریشان ہو رہی ہیں امی  
امی نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”لڑکی تیری عقل تو ٹھکانے ہے۔“

شادی بیاہ کا معاملہ کوئی ایسی کھیل تو نہیں۔

”لہجے تیاری تو سب ہے پھر گھبرانے کی کیا بات ہے۔“ وہ بے نیازی سے

بولی۔

”تیاری۔“ امی نے حیرت سے کہا مجھے نہیں پتہ کہ تو کیا کہہ رہی ہے۔

”امی دیکھئے؟ جہیز تو سب بنا رکھا ہے اوپر کے خرچے کیلئے بینک میں کچھ  
رہی ہے۔ شایہ آفس سے بھی کچھ قرض مل جائے بس اب تو فکر نہیں ہے نا آپ کو۔

”کونسا جہیز۔“ امی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہی جو میرے لئے بنا تھا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”ہوش کی دوا کر لوگی۔“ انہوں نے ڈبٹ کر کہا۔ ”وہ تیرے ہم کا ہے تیرے

پیسے سے بنا ہے۔ میں نے اتنے ارمانوں سے تیرے لئے بنایا ہے۔ سروش وہ کسی کو نہیں  
دیا جائے گا کبھی تو۔“

”ناشی آپ کی بیٹی نہیں ہے امی اس کو دیا یا مجھے ایک ہی تو بات ہے۔“ وہ

جلدی سے بولی۔ امی نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کوئی ان کی عزیز ترین شے پیسنے

لئے جاتا ہے۔ انہوں نے اس کا سراپے شانے سے لگا لیا اور دنگی سے لہجے میں

بولیں۔ ”میری بیٹی سروش تو اسی لئے پیدا ہوئی تھی کہ اپنی خوشیاں سب میں بانٹتی

پھرے۔“



مخلص کیلئے تم اپنی خوشیاں کیوں سچ دو۔ وہ کم بخت پتہ نہیں کہاں عیش کر رہا ہے اور تم بس  
وہی اک بات لئے بیٹھی ہو۔“

”پلیز رضی بھیا! آپ اس ذکر کو ختم نہیں کر سکتے۔“

اس نے اتکا کر کہا۔ ”مجھے نفرت ہے اس رشتے سے، اس تعلق سے، محبت پر

سے میرا اعتبار اٹھ گیا ہے۔“

رضی بھیا شٹا کر بولے۔ ”سروش! تم سے تو کچھ کہنا ہی فضول ہے۔ انکی امی

کھو پڑی ہے تمہاری۔“ انہوں نے اٹھ کر اس کے بال بکھیر دیئے۔

سروش نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”رضی بھیا! آپ کی وجہ سے مجھے بڑا حوصلہ رہتا

ہے۔ سچ کہوں آپ تو میرے سب سے اچھے دوست ہیں۔ کہئے نا اس وقت بھی آپ

میرا ساتھ دیں گے پلیز۔“

رضی بھیا میں نہیں چاہتی کہ ہوش بھی میری طرح زندگی گزارے۔ میں اس

کیلئے خوشیاں محفوظ کر دینا چاہتی ہوں۔

رضی بھیا کچھ دیر اس کی جانب دیکھتے رہے۔

وہ پر امید نگاہوں سے ان کی جانب تک رہی تھی۔ انہوں نے ہولے سے اک

چپت اس کے رخسار پر بھائی۔ سروش کی بیٹی تم مجھے مجبور کر دیتی ہو۔



بات طے ہو گئی تھی۔ ادھر نازش کے پرچے ختم ہوئے۔ ادھر وہ لوگ تاریخ

لینے آ پہنچے۔ موسم بھی اچھا تھا۔ گرمی جاری تھی۔ گلابی جاڑے شروع ہو رہے تھے۔

سروش نے بڑے اطمینان سے تاریخ دے دی۔ ان لوگوں نے ابھی گھر سے قدم نہیں

نکالا تھا۔ کہ امی کو اختلاج شروع ہو گیا۔ انہیں یہی لگ کر کھائے جاتی تھی۔ کہ اتنی جلد تیاری

نازش نے جھکی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اس کے ہونٹ کچھ کہنے کیلئے لرزے لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔



اپنے بستر پر لیٹی ہوئی وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ آج خوش تھی۔ یا ادا اس بمغموم تھی، یا سرور، مطمئن تھی، یا بے سکون وہ مطمئن ہونے کے بجائے کچھ دلبرداشتہ سی ہو رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے بہت تھک گئی ہے چلنے کی سکت نہیں رہی دم پھول رہا ہے۔

اس کی سب سے بڑی آہ: "پارن ہوئی مہا۔ نازش اپنے گھر کی ہو گئی تھی۔ ویسے پر اس سے ملی تھی۔ تو بہت خوش تھی۔ اندرونی سرت سے اس کا دل کش چہرہ بکھار ہوا جاتا تھا۔ سروس اسے رنج کر سرد رہتی ہوئی تھی۔ لیکن خود جیسے اندر سے ٹوٹ بھونٹ گئی تھی۔

اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ بکھر گئی ہے۔ اسے ریزہ ریزہ ہوا میں اڑ رہا ہے۔ یوں جیسے طوفان میں گھر گئی ہے۔ وہ پشیمان سی ہونے لگی تھی۔ کیا وہ دوسروں کو خوشیاں دے کر یوں ہی غم سہتی رہے گی۔ بری کہلاتی رہے گی۔ تاکر وہ گناہوں کی پاداش میں لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل ہوتی رہے گی۔ ان دلچسپے اثرات اپنے سر لٹکتا رہے گی۔

اس نے اک آہ بھر کر سوچا میں نے کیا کیا ہے؟

میرا کیا تصور ہے؟ اسے وہ اذیت ناک لمحہ یاد آ رہا تھا۔ جو کانٹے کی طرح اس کے سارے وجود کو زخمی کر گیا تھا۔ جو اک ٹیس سی بن کر اس کے روئیں روئیں میں سما گیا تھا۔ شادی کی جیتی جاگتی رونقوں میں کھوس گئی تھی۔ سارے انتظامات اسے ہی تو

سروس نے اک لمحے کو سوچا کہ کبھی اسے بھی خوشیاں ملیں گی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اس خیال کو ذہن سے جھٹک کر گفتگو سے بولی۔

"بس امی اب تیاری شروع کر دیجئے آپ کی بیٹی کی شادی ہو رہی ہے۔"

انہوں نے بڑی حسرت سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی فراخ پیشانی چوم لی۔

سروس بہت خوش اور مطمئن تھی۔ اس کی اک آرزو کی تکمیل ہونے والی تھی۔ وہ نازش کیلئے بہت فکر مند رہتی تھی۔ وہ اپنی طرح اس کی زندگی کو روک نہیں لگانا چاہتی تھی۔ وہ اسے منزل تک پہنچا دینا چاہتی تھی وہ ممکناتی ہوئی کرے میں داخل ہوئی تو نازش کو کھڑکی کے قریب کھڑے دیکھا وہ اس کے قریب آن کھڑی ہوئی اور اس کے بال الجھاتی ہوئی بولی۔ "ناشی تو بھی تیاری شروع کر دے نازش جو منہ پھیرے کھڑی تھی اس نے پلٹ کر دیکھا اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں اس کے رخسار جھکتے تھے۔ سروس نے محبت سے کہا "ارے۔ ناشو کیوں رو رہی ہے بچی۔"

"بس رو رہی ہوں۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔ "بس آپ ہیچ اپنی مرضی کرتی ہیں ہماری ایک نہیں سنتیں۔"

"بہت۔" وہ خوش دلی سے بولی۔ "ابھی لڑکیاں تو ایسی باتوں میں دخل نہیں

دیا کرتیں۔"

نازش مسکراتی تک نہیں جتے ہوئے آنسو بونچھ کر بولی۔

"آپ کیوں اپنی زندگی خراب کرتی ہیں نہیں بھی تو کچھ کرنے دیں میں نہیں

لوں گی آپ کا ہمیرہ آہلی وہ آپ کیلئے بنا تھا آپ کیلئے۔"

"فضول ہاتھیں نہیں کرتے ناشی۔" وہ محبت سے بولی۔ "دیکھ تو مجھے خوش دیکھنا

چاہتی ہے تو کچھ مت کہنا نازش تو اپنے گھر کی ہو جائے گی تو مجھے کوئی فکر نہیں رہے گی۔"

وہ حیرت سے سوچ رہی تھی کہ اس نے تو اتنا سب کچھ اپنے گھر کی خوشیوں کیلئے لٹا دیا تھا۔ لیکن اس کے بدلے اسے کیا ملا تھا۔ یہ طے نہ ہو سکتا تھا کہ یہ شرم ناک الزام۔ وہ صدمے سے بڑھ چلا ہی ہو گئی۔ دوسرے لوگ اس کے بارے میں اتنی گھنیا رائے رکھتے تھے۔

اس کا جی چاہا کہ ان سے پوچھے تو سہی کہ اس نے کیا کیا ہے جو وہ اس کی ذات پر کچھ اچھا حال رہے ہیں۔ لیکن وہ ان کی ذہنیت نہیں بدل سکتی تھی۔ اس نے ہونٹ کاٹ کر خود پر بے شکل قابو پایا اور جو عمل قدموں سے چھپلے دروازے سے باہر نکل آئی۔ وہ نہ لائی آنکھوں سے راستہ دیکھنا محال تھا۔ وہ لڑکھڑائی تھی جلدی میں سامنے سے آتے ہوئے رضی بھیما سے ٹکرائی۔ انہوں نے اسے سنبھال لیا۔

”سروش کیا ہوا ہے تمہیں؟“ انہوں نے اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر فکر مندگی سے پوچھا۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟“

”ٹھیک ہوں میں بالکل۔“ اس نے دائیں بائیں سر زور سے جھٹکا۔

”کچھ نہیں ہوا مجھے کچھ نہیں کچھ بھی نہیں اور آگے بڑھ گئی۔“

انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔ ”نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ بتاؤ

مجھے۔“ انہوں نے بڑی اہمیت سے کہا تو سروش کا جی چاہا کہ ان کے گلے سے لگ کر

دیکھنے بھالنے تھے۔ وہ خوشی خوشی سارے کام نپٹا رہی تھی کبھی یہاں ہوتی تو کبھی وہاں بڑے کمرے میں کھڑی وہ الماری میں سے کچھ نکال رہی تھی کہ اس کی جانب پشت کئے ہوئے مہمان عورتوں کے جھرمٹ میں سے آواز آئی۔

”نازش تو چھوٹی ہے سروش سے؟“

”اچھا۔“ کسی نے بڑی حیرت سے کہا۔ ”تو پہلے بڑی بہن کو کیوں نہیں

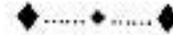
بیابا۔“

”ارے اس کو کون بیابا ہے گا۔ اس کی تو منگنی ہو کر چھوٹ گئی۔ لڑکے نے خود انکار کر دیا کسی اور نے اطلاع دی۔“

”بھئی کچھ دیکھ سن کر ہی کہا ہوگا۔ مردوں کے دفتر میں تو کام کرتی ہے پتہ نہیں کس کس کے ساتھ آوارہ گردی کرتی ہے۔“

ایسی آزاد لڑکیاں کہاں شادیاں کرتی ہیں۔ انہیں پوچھنے والے بہتر سے وہ اک کی پابند ہو کر کہاں رہتی ہیں۔ ”کوئی اور کہہ رہی تھی۔“

سروش کی آنکھوں میں آنسو اٹھ آئے۔ وہ حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ کہ یہ سب اس کی اپنی ذات کے بارے میں کہا جا رہا ہے۔



”روز نے آہستہ سے سرگوشی میں اسے بتایا نئے ہاس آگئے ہیں۔“

”اجھا؟“ وہ حیران رہ گئی۔ عدنان صاحب کہاں ہیں؟

ان کی تو پوسٹنگ ہو گئی ہے۔“

”سب؟“

”ہنست بھرتو ہو گیا ہے۔“

”سروش لگرمند سی ہو گئی۔ اسے تو عدنان کی ٹرانسفر کے بارے میں کچھ بھی پتہ

نہیں چاہتا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ نئے ہاس نہ جانے کیسے آ دی ہوں گے۔ عدنان کی وجہ

سے تو وہ خود کو بہت محفوظ سمجھتی تھی۔ کسی طرح کا فکری نہیں تھا۔

لیکن اب تو وہ نئے ہاس کو دیکھ کر اور بھی پریشان ہوئی تھی۔ وہ خاصے رنگین

حراج اور پختہ کار آ دی تھے۔ جو زبان سے زیادہ آنکھوں سے کام لیتے تھے۔ اس کی مٹھا

خیر نگاہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کہتی رہتی تھیں۔ خصوصاً دفتر میں کام کرنے والی لڑکیوں پر

تو وہ بہت مہربان تھے۔ کچھ آزاد خیال لڑکیاں ان کے ساتھ کچھ شامیں بھی گزار آئی

تھیں۔

ہر وقت بنے سنورے رہتے تھے۔ عمدہ کپڑوں کی خوشبو پانچ منٹ پہلے ہی ان

کے آنے کی خبر دے دیتی تھی۔ ان کا دھیان کام میں بہت کم رہتا تھا زیادہ توجہ اپنی

نوازشات عام کرنے کی طرف رہتی تھی۔



سروش تو دو چار دنوں میں ہی پریشان ہو گئی۔ عدنان سے بھی ملی وہ خود پریشان

تھا۔ اسے سارا گھراٹھا کر دوسرے شہر جانا پڑ رہا تھا۔ اس نے تباہ لے کو منسوخ کرانے کی

جی بھر کے روئے ان سے زمانے بھر کی شکایتیں کرے۔

ان سے پوچھے کہ اگر عامر نے مٹھی توڑ دی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور

ہے؟ اگر وہ مردوں کے دفتر میں کام کرتی ہے تو کیا وہ بری لڑکی بن گئی ہے لیکن ان سے

یہ سب کچھ کہہ دینے سے کیا حاصل۔ وہ یا رضی بھیا یا کوئی بھی دوسروں کی رائے نہیں

بدل سکتا تھا۔

اس نے یونہی پیشانی سے بال ہٹائے اور رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”رضی

بھیا! کوئی بات نہیں کچھ بھی نہیں۔“

”جھوٹ نہ بولو۔ لڑکی“ انہوں نے انگلی سے اس کا رخسار چھوا۔

سروش کے آنسو ٹپک پڑنے کو تھے۔ اس نے ہونٹ کا اک گوشہ دانتوں میں

دبا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ”رضی بھیا! ابو یاد آرہے ہیں۔“

”اوہ۔“ رضی بھیا پریشان سے ہو گئے۔

انہوں نے محبت سے اس کا بازو تھپتھپایا۔ ”ارے بچی یوں دل تھوڑا کیوں

کرتی ہو چلو جا کر کام نپٹاؤ جلدی سے۔ چلو چلو تم رونے بیٹھ گئیں تو سارا کام کون کرے

گا۔“ وہ اسے بازو کا سپہاڑا دیتے ہوئے باہر لے آئے۔



وہ شادی کے چنگاموں میں مصروف رہی تو کئی روز تک دفتر کا رخ ہی نہیں

کیا۔ عدنان نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ دل کھول کر چھٹیاں کرے۔ مصروفیت

اتنی رہی کہ نسیم سے بھی شادی پر ہی ملاقات ہو سکی۔ آفس بنگلی تو فضا کچھ بدلی ہی نظر آتی

تھی۔ سب سے ملی، مہار کباد وصول کی۔

کوشش بھی کی تھی۔ لیکن نئے ہاس کا اثر و رسوخ کچھ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوئی تھی۔

سروش عجیب مشکل میں گرفتار ہو گئی تھی۔ کچھ دنوں سے وہ دیکھ رہی تھی کہ نئے ہاس چنگیزی صاحب اس پر کچھ زیادہ ہی مہربان تھے۔ نوش لینے وقت انہیں ڈاک دیتے وقت کوئی اور کام ہوتا تب بھی ان کی معنی خیز نگاہیں اس کا طواف کرتی رہتی تھیں۔ سروش بظاہر انجان بنی رفتی با ضرورت ان سے کوئی بات نہ کرتی۔ لیکن ان کی گفتگو ایسا پہلو دار ہوتی کہ کوئی نہ کوئی معنی سمجھا جاتی۔ اکثر فائیس یا کاغذات وغیرہ انہیں دیتے ہوئے وہ دانستہ اس کا ہاتھ چھونے کی کوشش کرتے۔ وہ کوئی عام سا پرنٹ یا ساواہ سی ساواہی بھی پیٹے ہوتی تو وہ غیر ضروری تعریف کرنے لگتے۔ اکثر و بیشتر انہیں چائے میں بھی شریک کرتے اور لمبی چوڑی گفتگو چھیڑ دیتے۔

سروش اس صورتحال سے پریشان ہو گئی تھی۔ وہ اس سنجیدگی سے استغفیٰ دینے کے متعلق سوچنے لگی تھی۔ ان کی مفلوک نوازشات سے بچا نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ جتنی سنجیدہ تھی۔ وہ اتنے ہی باتونی اور شوخ تھے۔ اکثر اس کے کام پر کوئی بے معنی سا اعتراض کر کے اسے گفتگو میں الجھانے کی کوشش کرتے۔ ان کی آواز نگاہیں اسے بہت کچھ سمجھاتی تھیں۔ وہ مجبوراً یہ سب کچھ برداشت کر رہی تھی۔ اس لئے کہ اسے ملازمت کی ضرورت تھی۔ ابھی اسے بہت کچھ کرنا تھا۔ کوئی دوسری ملازمت اتنی جلد مل جانے کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے دوسرے حکموں میں درخواستیں بھی دے رکھی تھیں۔ اسی انتظار میں تھی کہ کسی دوسری ملازمت کی امید ہوتے ہی وہاں سے پیچھا چھڑا لے۔



اس روز وہ چھٹی کے وقت تک مصروف رہی کتنے ہی خطوط ٹائپ کرنے تھے وہ جلدی جلدی کام ختم کر کے اٹھنے لگی کہ ہاس نے کچھ اور خطوط بھجوا دیئے کہ انہیں ابھی ٹائپ کر کے بھجوانا ہے۔

سروش بہت بیزار ہوئی تقریباً سب لوگ چھٹی کر کے جا چکے تھے۔ وہ تنہا آفس میں نہیں ٹھہرنا چاہتی تھی۔ اس نے کاغذات اٹھائے اور اس کے کمرے میں جا پہنچی وہ اطمینان سے بیٹھے سرگت لہا رہے تھے۔ سروش کو دیکھا تو مسکرائے آئے آئے مس سروش تشریف لائے۔

سروش نے کھڑے ہی کھڑے کہا نہیں سر شکر یہ!

مجھے آج جلد مگر جانا ہے میں کل صبح ہی یہ خطا ٹائپ کر کے پوسٹ کروا دوں

کی۔

وہ غور سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر بڑی فراہدی سے بولے۔ ”مجھے

آپ کی مرضی مس سروش اچھے آپ کی خوشی۔“

”جھینک پوسر!“ سروش نے اتنی جلد جان چھوٹ جانے پر دل ہی دل میں شکر ادا کرتے ہوئے کہا اور جانے کیلئے پلٹ گئی۔

”سنئے تو مس سروش۔“ انہوں نے پکارا۔ سروش نے سڑ کر ان کی طرف

دیکھا۔ یہاں آئے انہوں نے سر سے اشارہ کیا۔

سروش کچھ ہنسی اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی ان کی میز کے قریب آ گئی۔

”بیٹھے۔“ انہوں نے بڑی خوش اخلاقی سے کہا۔

”جی نہیں میں یونہی لھیک ہوں۔“ سروش نے کرسی کی پشت پر ہاتھ رکھتے

ہوئے کہا آپ فرمائیے۔

میں ایک شریف لڑکی ہوں گے آپ۔“

”ہوں۔“ انہوں نے جیسے طنزیہ لہجہ ہی ہوں کی۔

”مسٹر عدنان کی تو اور بات ہے مس سروش۔ لیکن عاصم صاحب سے وابستہ رہنے والی لڑکیوں کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔ کیا خوش ذوق آدمی ہیں میں ہمیشہ ان کے ذوق کا مستغرق رہا ہوں۔ ان کی منحور نظر لڑکیاں ہمیشہ انتخاب ہوتی ہیں گھید، سچا موتی۔“

”میں کسی عاصم کو نہیں جانتی۔“ اس نے مجھ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔  
”میرا کسی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں جارعی ہوں۔ میں آپ جیسے انسان کے ساتھ ہرگز کام نہیں کر سکتی۔“

”آپ کی طرح آپ کی اماںیں بھی دلکش ہیں۔ وہ صحن دروازے کے سامنے آن کھڑے ہوئے۔“



ان کے چہرے پر اک عجیب سا تاثر تھا اور آنکھوں میں ناقابل فہم چمک۔

”آپ بیٹھے سے گھبرائی کیوں ہیں؟“ وہ مسکرائے۔

”جی نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“ سروش نے جلدی سے کہا۔ ”میں جلدی مگر

جانا چاہتی ہوں۔ میری والدہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”اوہ۔“ وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے آپ کو جلدی جانا ہے تو میں آپ کو

مچھوڑ دوں۔“

جی نہیں شکر یہ! میں خود ہی چلی جاؤں گی۔“ وہ جگت میں بولی۔

وہ دو ہی قدموں میں اس کے قریب آگئے۔ ”مس سروش! آپ اتنا خائف

کیوں رہتی ہیں میں اتنا برا تو نہیں ہوں۔“

سروش اک قدم پیچھے ہٹ کر بڑی سنجیدگی سے بولی۔ ”نہیں سراسر ایسی تو کوئی

بات نہیں ہے۔ آپ ہمارے پاس ہیں اور ہم یہ فاصلہ برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔“

”نہیں مس سروش!“ انہوں نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”یہ فاصلہ تو بہت

زیادہ ہے۔ سروش نے گھبرا کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور برہمی سے بولی۔ ”سر! آپ مجھے غلط

سمجھ رہے ہیں۔ میں کوئی ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے اس قسم کی بے تکلفی بالکل پسند

نہیں ہے۔“

وہ یوں بے ساختہ ہنسے جیسے اس کی بات سے بہت مگھوڑ ہوئے ہوں۔ ”آپ

کے متعلق جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ جی ایک بات کے ہم قائل ہو گئے کہ ساری ہی

لڑکیاں بڑی اچھی اداکارہ ہوتی ہیں۔ اپنے قریب آنے والے ہر مرد سے وہ یہی کہتی

ہیں کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔“

سروش کا تپ گئی۔ تلخی سے بولی۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے چنگیزی صاحب!

وہ ایک دم حیران رہ گئے اور اپنا چہرہ بالکل اس کے مقابل لا کر بولے۔ ”مس سروش! یہ آپ کہہ رہی ہیں؟“

سروش کا سانس الجھنے لگا۔ وہ اس کا ہاتھ پٹا کر دوڑ پٹی گئی۔ وہ مسرت سے لہریز آواز میں بولے۔ ”آج تو آپ اک نئی حیثیت سے حصارف ہوئی ہیں۔ آج کی شام اس خوشگوار اتفاق کے نام ہے۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ ”آئیے چلتے ہیں۔“

سروش اپنی ہی نگاہوں میں حقیر ہوئی جاتی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے غرار آلود آواز میں کہہ رہے تھے۔ ”آپ کا بس کتنا خوشگوار ہے جیسے نرمس کے پھولوں سے مٹی بھری ہو۔“

وہ اس کا ہاتھ تھامے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ سروش ان کے ساتھ جیسے گھسٹ رہی تھی۔ گاڑی کے قریب پہنچ کر وہ جیسے ہی دروازہ کھولنے کو جھکے تو وہ تیزی سے بھاگتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی۔ اس کے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سن کر انہوں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔ لیکن وہ سڑک پر پہنچ چکی تھی۔



وقت گزرتے در نہیں گنتی۔ کتنی ہی تبدیلیاں آتی ہیں۔ کتنی ہی قیامتیں گزر جاتی ہیں۔ غم کی طول طویل مٹھتی ہوئی گھڑیاں اور خوشی کے تیزی سے پھیلنے ہوئے رنگین لمبے۔ پلک جھپکتے میں اڑے چلے جاتے ہیں۔ اپنے پیچھے ان سب نعوش چھوڑنے ہوئے ہمیشہ کے لئے زندگی سے دور نکل جاتے ہیں۔

چنگیزی صاحب کے واقعے کا تذکرہ اس نے مگر میں کسی سے نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد وہ دفتر نہیں گئی تھی۔ تھوڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے ایک اور جگہ ملازمت مل

سروش سنانے میں آگئی۔ اس کے رگ و پے میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس نے دہشت زدہ آنکھوں کے ساتھ ہاس کی طرف دیکھا۔ وہ پاپ چباتے ہوئے بڑی دلچسپی سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ ”ہم عامم کی طرح وجیہہ تو نہیں ہیں لیکن آپ ان ہی کی طرح ہمیں بھی فیاض اور اپنا پرستار پائیں گی۔“

”آپ! آپ! میری مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔“ سروش نے تھلا کر کہا۔ ”ہم فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔ ہم تو فیض پانا چاہتے ہیں۔“ وہ قریب آئے۔ سروش ہم کرانے قدموں پیچھے ہٹی۔

”نہیں! نہیں۔“ وہ دہشت زدہ ہی ہو کر پیچھے ہٹتی گئی اور دیوار سے جا لگی۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونا محال تھا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑے گی۔ وہ مر جانا چاہتی تھی۔ عامم نے اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔

وہ اور آگے بڑھے اور اپنے دونوں ہاتھ اس کے ارد گرد دیوار پر رکھ دیے اور ہنس کر بولے۔ ”اب کہئے؟ ہم چاہیں تو آپ یہاں سے اک اچھ بھی نہیں مل سکتیں۔“ سروش کی جان پر بن گئی۔ وہ اس شخص کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔ خوف کی شدت میں اس نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر گزری۔ بڑی کوشش سے اس نے اپنے حواس مجتمع کئے اور ہانپتی ہوئی بولی۔

”سرا کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔“

کہ اندر کمرے میں بیٹھی ہوئی ممانی کی آواز آئی جو راجہ کے پاس بیٹھی اٹکھا رشتہ فرما رہی تھیں۔ ”اے راجہ بیٹے! اب تو تمہاری شادی ہو جانی چاہیے۔ گھر بسانے کی یہی تو عمر ہے۔“

”جانے دیجئے ممانی جان! کچھ روز ہمیں بھی عیش کر لینے دیجئے۔“ راجہ حسب عادت مذاق کے موڈ میں تھا۔

”نہیں بیٹا! یہی تو وقت ہے۔“ بڑے عالمانہ انداز میں اسے سمجھانے لگیں۔

”تیری ماں تو اب ان معاملوں کو اچھی طرح نہیں دیکھ سکتی۔ نازش اپنے گھر کی ہو گئی۔ اب تو سروش بیٹی کو سوچنا چاہئے۔ کچھ ادھر ادھر دیکھیں بھالیں۔ بیٹا تجھ میں کس بات کی کمی ہے۔ تجھے تو ہزاروں چاندی دہنیں ملیں گی۔“

”تو تو بے ممانی جان! میں اتنی دہنیں لے کر کیا کروں گا۔ پہلے ہی مہنگائی آتی ہے۔“ وہ اب بھی سنجیدہ نہیں تھا۔

”تو تو ہر بات ہنسی میں اڑاتا ہے۔“ وہ برمانتے ہوئے بولیں۔ ”پر یہ میرا کام بھی تو نہیں ہے۔ سوچنا تو سروش کو چاہئے؟“

”ممانی جان!“ راجہ اچانک سنجیدگی سے بولا۔ ”اسے تو ہمارے لئے سوچنا چاہیے تو کیا ہمیں اس کے متعلق نہیں سوچنا چاہیے۔ اس نے ساری زندگی ہم لوگوں کے لئے برباد کر دی تو کیا اب ہمارا کوئی فرض نہیں۔“

”ہے کیوں نہیں۔“ ممانی نے فوراً تائید کی۔ ”پر بیٹا! اس کی تو عمر نکل چکی ہے اور بچ پوچھو بیٹا! ایک بار کہیں بات ہو کر نوٹ جائے تو لڑکی کا دل بھی ٹوٹ جاتا ہے اور میرے منہ میں خاک، ایک بار کہیں لڑکی کا نام جوڑ دو، پروا ان نہ چھے تو لوگ وہاں رشتہ ناطہ کرتے ہوئے بھی گھبراتے ہیں۔“

”تو کون الٹو کے پٹھے لوگ ہیں۔“ وہ غصے سے چلایا۔ ”مٹکی ہی تو ٹوٹی تھی۔“

مکی تھی۔ وقت بڑی سہولت سے کٹ رہا تھا۔ حالات سدھر گئے تھے۔ راجہ مقابلے کے امتحان میں اچھی پوزیشن سے کامیاب ہوا تھا اور ابھی پوسٹ پر تھا۔ جھنوکا کالج میں تھا اور نازش ایک پیاری سی بچی کی ماں بن گئی تھی۔

اس نے اپنے متعلق تو کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ زیادہ تر خود کو مصروف رکھتی تھی۔ گھر کے کام میں امی کا ہاتھ بنا دیتی تھی۔ امی اب بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ وہ کئی بار اسے دے دے، بے لفظوں میں کہتی تھیں کہ وہ اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کرے۔ کبھی کبھی رضی بھی آتے تو ان سے اس موضوع پر خوب بحث ہوتی۔ راجہ نے الگ منہ پکڑی تھی کہ وہ اس وقت تک شادی نہیں کرے گا جب تک کہ وہ شادی نہیں کر لیتی۔

وہ آگتا جاتی پریشان ہوتی۔ بھلا وہ اپنے بارے میں کیا سوچے؟ ان محبتوں نے اسے کیا دیا تھا۔ حاصر جسے اس نے ٹوٹ کر چاہا تھا۔ کس طرح اس کی زندگی سے نکل گیا تھا اور عاصم نے اسے کھلونا سمجھا تھا۔ اسے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ کسی کی تمنا کرنے کس کو چاہیے؟ وہ کسی کا سہارا نہیں لینا چاہتی تھی۔ وہ کسی کی قربت نہیں چاہتی تھی۔

لیکن کسی وقت نہ جانے کیوں احساس ہوتا تھا جیسے کوئی عزیز شے کھوئی ہے۔ جیسے زندگی میں کوئی کمی ہو گئی ہے۔ کسی وقت وہ بے پناہ سوچوں کی یلغار میں پکرا سی جاتی۔ اس کے بھائی بہن اپنی منزل پر پہنچ گئے تھے۔ اب کوئی مقصد سامنے نظر نہیں آتا تھا۔ اب آگے بڑھنے کے لئے کوئی دلوں کوئی انگ ساتھ نہیں تھی۔ زندگی کچھ پھسکی پھسکی سی اور بے رنگ ہو گئی تھی۔

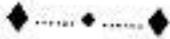


اک روز وہ باہر برآمدے میں لگی ہوئی تل کی قاتلو شائیں چھانٹ رہی تھی

تھا۔ وہ عمر کے اس دور میں کس کا ہاتھ پکڑے، کس کا دامن تھام لے کے ساتھی بنائے۔ وہ خود اپنے لئے کیا سوچے۔ کوئی اس کے لئے سوچنے والا نہیں تھا۔ اب اس کے لئے اوجیز عمر دوسری شادی کے خواہشمند نو دولتوں کے پیام آتے تھے۔ وہ کس طرح ان کا سہارا لے جو خود سہاروں کے متلاشی تھے۔ زندگی کا پر غلوس ساتھی تو زندگی سے بہت دور تھا۔ اب دل میں کوئی ولولہ، کوئی تنہا، کوئی آرزو نہیں رہی تھی۔ کوئی مدعا، کوئی خواہش نہیں تھی۔ کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ بھی تو نظر نہیں آتا تھا۔

اس نے دل میں پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ راجہ کو منا ہی لے گی۔ جلد سے جلد اس کی شادی کرنے کی کوشش کرے گی جو ہمیشہ یہی عذر رکھتا تھا کہ وہ تب ہی شادی کرے گا۔ جب خود سرور شادی بھی شادی کے لئے رضامند ہوگی۔ لیکن وہ کس کے لئے رضامند ہو جاتی، کس کے لئے ہاں کر دیتی، کون تھا؟ جو اس کا ہاتھ تھام لیتا۔ عمر کے اس دور میں وہ کسی کے ساتھ بھجوتے کرنے کو جتنی طور پر تیار نہیں تھی۔

زندگی کا سنہرا دور گزر گیا تھا۔ روشنی کی کرنیں اسے چھوتی ہوئی دور نکل گئی تھیں۔ دور اڑتے ہوئے جھنڈوں کو منگی میں لے لینے کی خواہش لا حاصل تھی۔



کہیں طلاق تو نہیں ہوگی تھی۔“

”پر جینا! تو کب تک انتظار میں بیٹھے گا۔ وہ تو سنا ہے کسی کل بیٹھی ہی نہیں۔ کسی کے لئے ہاں کر کے ہی نہیں دیتی۔ وہ تو پتہ نہیں دل میں کیا لئے بیٹھی ہے۔ اب سارے گھر کو تو خانقاہ بنا دے۔“



راجہ غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن سرور ش میں اور سننے کی تاب نہ تھی۔ اس نے ہاتھ سے قبچھی رکھی اور وہیں طر حال ہی برآمدے کی بیڑھیوں پر بیٹھ رہی۔

گھٹنوں پر سر رکھے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کیا ایک مرد کا ہاتھ تھامے بغیر اس کی کوئی عزت نہیں۔ اس کی کوئی وقعت نہیں۔ اس نے جوانی کے انگٹوں بھرے دن دفتر کی فائکوں کے درمیان کاٹ دیئے تھے۔ لیکن دوسروں نے اسے اور ہی معنی دیئے تھے۔ اس نے مجبور ہو کر دفتر میں ملازمت کی تھی۔ لیکن دوسروں نے اسے رنگ رلیوں کا نام دیا تھا۔ اس نے انہوں کے لئے زندگی گزار دی تھی۔ لیکن اس کا صلہ شلک و شہبہات تھے جو اس نے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھے تھے۔

اس نے بھی تو خواب دیکھے تھے۔ اس نے بھی تو پتہ نہ تھا۔ اس نے بھی تو تمناؤں کو نئے رنگ دیئے تھے۔ لیکن اسے کچھ بھی نہیں ملا تھا۔ کوئی نہیں سوچتا تھا کہ اس نے کس طرح سے اپنے من کو مارا یا تھا۔ اپنے جیلے ارمانوں کا خون کیا تھا۔ اپنے گھر کو گھربنائے رکھا تھا۔ اسے ٹونے نہیں دیا تھا۔ اسے ٹھہرنے سے بچایا تھا۔

لیکن کسی کو یہ سب یاد نہیں تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ وہ شادی کیوں نہیں کرتی۔ وہ تمہارا کر رنگ رلیاں منانا چاہتی ہے۔ سوچ سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہو گیا

کی باتیں اپنے بچے کی ننھی اور مصوم بیاری باتیں اور دوسری سٹنگلز ہاتھیں۔  
وہ آجاتی تھی تو گھر کی فضا جاگ اٹھتی تھی۔ اک انوکھی سی چہل پہل ہر طرف  
نظر آتی تھی۔ عموماً مسلمان بھی اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ بہت اچھا اور سلجھا ہوا لڑکا تھا۔  
رعبہ اور جگنو کے ساتھ اس کی خاصا دوستی تھی۔ وہ اس سے بھی بے تکلف تھا اور تازش کی  
بچی جنگی تو اس کی دیوانی تھی۔

وہ یونہی کسی کام سے بازار تک گئی۔ تازش کی بچی جنگی بھی ضد کر کے اس کے  
صراہ چل پڑی تھی۔ لیکن اب اسے کسی پل قرار نہیں آ رہا تھا۔ سوال پر سوال کر کے اس  
نے سروش کا تاک میں دم کر رکھا تھا۔ وہ اسے ساتھ لاکر بچھتا رہی تھی۔ اس نے نہ تو  
اچھی طرح سے خریداری کرنے دی اور اب اس سے چلا بھی نہیں جا رہا تھا۔ بار بار کہہ  
رہی تھی کہ اسے گود میں اٹھالیا جائے یا کوئی سواری لی جائے۔ اسے شاید جوہ بھی کات  
رہا تھا۔



سروش اسی گھر میں تھی کہ کوئی ٹیسی وغیرہ مل جائے تو کسی طرح گھر پہنچے۔ اسی  
انتظار میں وہ فٹ پاتھ پر کھڑی تھی کہ سنہری بالوں والی ایک گڑیا سی بچی بھاگتی ہوئی اس  
کے قریب سے گزری۔ وہ ہنستی ہوئی بار بار پیچھے دیکھ رہی تھی۔ جیسے کوئی اس کے پیچھے آ  
رہا ہو۔ اچانک وہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ اس کا خوبصورت فراک مٹی میں بھر  
گیا تھا۔ سروش نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور اس کے کپڑوں سے مٹی جھاڑی۔ بچی  
گھبرا کر رونے لگی اور بار بار پاپا۔ پاپا پکارنے لگی۔

سروش نے پیچھے مڑ کر دیکھا کہ اس کا باپ کہاں ہے؟ اتنے میں اک لمبے  
ترنگے انگریز نے آ کر اسے گود میں اٹھالیا اور تیز تیز انگریزی بولوں ہوا بچی کو بھلانے

تازش کے آجانے سے گھر میں بہار آ جاتی تھی۔ فسی مذاق شوخیاں اور قہقہے  
سونے گھر کو جنت بنا دیتے تھے۔ اس کے چلے جانے سے وہ بعض اوقات بڑی تھائی سی  
محسوس کرتی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب تھی۔ جب دلچہ کہیں باہر ہوتا۔ جھٹوا اپنی دلچہ پیوں  
میں لگن ہوتا۔ اسی باورچی خانے میں معروف ہوتیں تو وہ گھنٹوں کھڑکی میں کھڑی نہ جانے  
کیا سوچتی رہتی۔

اک عجیب سی اداسی سارے وجود میں سرایت کر جاتی۔ اردگرد گہرا سناٹا چھا  
جاتا۔ تنہائی کا اک چال سا چاروں طرف پھیلتا ہوا نظر آتا۔ ایسے میں دل آپ ہی آپ  
کسی ایسے ساتھی کی قربت کی آرزو کرتا جو ان تنہائیوں کو مٹا دے۔ کوئی ایسا ہم نہیں جو  
روح کی اس پڑھوگی کو قشقل میں بدل دے۔ کوئی ایسا ہم راز جو زندگی کے وجود میں  
پہلے ہی پیدا کر دے۔

ایسے میں اسے تازش بہت یاد آتی۔ وہ ایسے اداس ماحول میں زندگی بھر رہتی  
تھی۔ کوئی ادھر ادھر کی بات لے بیٹھتی۔ کوئی تھہ پھیڑ دیتی۔ ریڈیو پر کوئی اچھا سا نغمہ لگا  
دیتی۔ کسی رسالے میں سے کوئی خوبصورت کھلا کوئی دلچریب نظم پڑھ کر سناٹی اور کچھ  
نہیں تو کسی نئی ڈش کو ہی آزمائے لگتی۔ اسی لئے جب تازش آ جاتی تھی تو وہ بہت خوش  
رہتی تھی۔ خود کو بہت تر دتا نہ محسوس کرتی تھی۔ یوں جیسے ہانسی کے الیلے دور میں واپس  
پلٹ آئی ہو۔ تازش کے پاس ہزاروں باتیں سنانے کو ہوتیں۔ اپنے گھر کی باتیں مسلمان

بچی نے بڑی خوبصورتی سے گھائی ہونٹوں کو جنبش دی اور گہری نیلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔ ”بیلو آئی! ہاؤ ڈو یو ڈو۔“ سروش نے مسکرا کر بیار سے اس کے گال کو چھو دیا۔ عامر نے کہا۔ ”سروش! اگر تم لوگ برانہ مناؤ تو میں آؤں گا۔ تمہارے یہاں لاؤں وہ یہاں کا گھریلو ماحول دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے خصوصاً تم سے ملنے کا بہت شوق ہے۔ وہ شاید اپنا اور تمہارا موازنہ کرے گی۔“ وہ ہنسا۔ ”عجیب خطبہ ہوتا ہے عورتوں کو بھی وہ میری پہلی محبت کو دیکھنا چاہتی ہے۔“

سروش کے دل میں پھانس سی اتر گئی۔ یہ لفظ اس کی زبان پر کتنا بے رونق اور بے معنی معلوم ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے اسے کوئی گالی دے دی ہے۔ وہ اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی بولا۔

”بہی تم نہ تو ہوں کرتی ہو نا ہاں میں ہی بولے جا رہا ہوں۔ شاید تم بہت ناراض ہو۔ لیکن سروش تم سمجھ دار ہو۔ تم تو چاہتی ہو کہ ماحول کے بدل جانے سے مزاج میں کتنی تبدیلیاں آتی ہیں۔ پچھلے فیصلوں پر ایک بار پھر سوچنا پڑتا ہے۔ وہاں کی زندگی یہاں سے بہت مختلف ہے۔ ماحول میں بڑا فرق ہے۔ میرا تو یہاں آنے کا کوئی موڈ نہیں تھا۔“ وہ بیزار سی بولی۔ ”کیسا عجیب و غریب ماحول ہے۔ یہاں کوئی فرق ہی نہیں پڑا اتنے سالوں میں اب تک وہی گندگی وہی ٹخنیں بس بہت عجیب و غریب لفظ ہے۔“ اس نے شانے اچکائے۔

سروش کو وہ اس طرح کہتا ہوا بہت برا لگا۔ وہ چپ نہ رہ سکی قدرے تلخی سے بولی۔ ”آپ تو اس طرح باتیں کر رہے ہیں جیسے وہیں پیدا ہوئے تھے۔“

”ارے۔“ وہ بے اوجھا محظوظ ہوا۔ ”تم تو اب تک وہی عی جذبائی ہو۔ بھی

لگا۔ سروش نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اسی وقت اس نے بھی سروش کی طرف دیکھا۔ حالانکہ اس کی وضع قطع خاصی بدل چکی تھی لیکن سروش اسے کبھی نہیں بھول سکتی تھی۔ وہ اسے صدیوں بعد بھی پہچان سکتی تھی۔ وہ اسے ہزاروں چہروں میں بھی شناخت کر سکتی تھی۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں دھیرے سے بڑبڑائی۔ ”عامر!“

وہ بھی اسے پہچان گیا تھا۔ حیرانی سے پلکیں جھپک کر وہ بڑی بے تکلفی سے صاف اردو میں بولا۔ ”ارے سروش! یہ تم ہو؟“

سروش حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہی وہ شخص تھا جسے اس نے دل کی گھرائیوں سے چاہا تھا۔ اس کی کیفیت عجیب سی تھی۔ اسے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ اسے ایک عرصے بعد دیکھ کر کیا محسوس کر رہی ہے۔

”اوہو! ایک عرصے بعد تمہیں دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔ یعنی میں تو تمہارے گھر بھی آتا چاہتا تھا۔ لیکن پھر خیال آیا کہ شاید تمہارے گھر والے پسند نہ کریں۔“ اس نے جلدی جلدی بولتے ہوئے انگریزی میں کہا۔ ”بھی تمہیں کوئی خوشی نہیں ہوئی مجھے دیکھ کر۔“

سروش اب بھی خاموش تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کیا بات کرے۔ اسے کیا کہنے کہنے کے لئے تو کچھ بھی نہیں تھا۔ دل میں ایسا کوئی جذبہ نہیں تھا جو الفاظ میں اجاگر ہو جاتا۔

وہ ہنس کر بولا۔ ”سروش! تم نے تو شاید بات نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ شاید ناراض ہو مجھ سے لو میری بیٹی سے تو ملو۔“ یہ سونا ہے۔ ”مونا آئی کو بیلو کو۔“ اس نے نیگی سے انگریزی میں کہا۔

سروش سن سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس میں تردید کا حوصلہ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ اسے اتنا بھی نہیں بتا سکی کہ اس نے کسی کا ہاتھ نہیں تھاما۔ کسی کو زندگی کا ساتھی نہیں بنایا۔ اس کے انکار کی سزا وہ اکیلی بھگت رہی ہے۔ اس کی بے وفائی کا داغ اس نے تنہا اٹھایا ہے۔ اس نے تنہا اپنی ذات پر ناکرہ اثرات جھیلے ہیں۔

آج بھی نہ چاہتے ہوئے چپکے چپکے اس کی یاد دل کے کسی نہ کسی گوشے میں چپکے سے ابھر آتی ہے۔ کتنی ہی بے خواب راتوں میں اس نے ستاروں سے اس کا نام لکھا ہے۔ اسے خوابوں میں دیکھا ہے۔ اس کے بارے میں بہروں سوچا ہے لیکن اس کی سرد مہری اور لاپاہلی انداز نے دل کے شیشے کو پختہ چور کر دیا تھا۔ وہ ہمہم سے تصورات وہ دہندگائی ہوئی سی آرزوئیں وہ سوہوم امیدیں ایک بار پھر اپنی صوب دکھلا کر اس کا سب کچھ جھین لے گئی تھیں۔ وہ اس ایک لمحے میں ہی ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ساری کائنات جیسے گھوم رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سب کچھ لٹ گیا ہے۔ کچھ بھی پاس نہیں رہا۔ وہ تنہا تھی اور زندگی کی طویل شاہراہ!!!



”آپ! اٹھ بھی جائیں میں تو تیار ہوں بالکل۔“ نازش نے شاید تیسری بار اسے جھنجھوڑا تھا۔ اس نے کسٹندی سے آنکھیں کھولیں۔ وہ شوخ رنگوں کی ساڑھی میں بڑی پرکشش لگ رہی تھی۔

یہی تو غلطی ہو گئی کہ وہاں پیدا نہیں ہوا۔ اچھی بھلی صورت کے ہوتے ہوئے اب بھی کالے ہی کہلاتے ہیں۔“

”کیا ضرورت تھی آپ کو یہاں آنے کی؟“ سروش نے جمل کر کہا۔

”میں تو شاید نہ ہی آتا مگر آرزو کی ایک ہی خدمتھی۔ اسے میرا ملک دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ پتہ ہے وہ اس ملک کو خوابوں کی سرزمین کہتی ہے۔“ وہ تسخر سے ہنسا۔

”میں نے کہا لو دیکھو اپنے خوابوں کی سرزمین۔“

سروش کو بہت غصہ آیا۔ وہ اسے گرد و پیش کا اور اس کا اپنا مذاق اڑاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے برہمی سے کہا۔ ”اگر آپ اس ملک سے ناطہ توڑ ہی چکے ہیں تو اس کا مذاق اڑانے کا بھی آپ کو حق نہیں۔“ اس کے انداز پر وہ زور سے ہنس پڑا۔ ”بھی ٹھیک کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگ مشرقی لوگ بڑے جذباتی ہوتے ہیں۔“

بچی اس کے گلے میں بازو ڈال ڈال کر اسے چلنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ عامر نے بے تکلفی سے سروش کے ساتھ ہاتھ ملائے ہوئے کہا۔ ”اتنے دنوں بعد تمہیں مل کر بہت خوشی ہوئی سروش! یہ مونا بہت بدمعاش ہے۔ اچھا بھئی چلتے ہیں۔“ وہ پھر بچی سے انگریزی میں بولا۔

سروش ہونٹ دانٹوں تلخے دبائے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ حیرت سے اور امرتگی سے سوچتی رہی کہ کیا اس شخص سے کبھی اس نے محبت کی تھی۔ وہ چپنے ہی والا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ سروش کے قریب کھڑی ہوئی بچی پر پڑ گئی۔

”ارے سروش!“ یہ تمہاری بیٹی ہے؟ کتنی بھاری ہے۔ اس نے رسماً ہانگی کا گال چھیڑ دیا۔ ”اچھا کیا تم نے بھی شادی کر لی۔ یہاں پتہ نہیں کون کہہ رہا تھا کہ تم نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ عجیب لوگ ہیں یہاں کے بونچی انواہوں پھیلا کر رہے ہیں۔“



جواب دیا۔

”ناشی تو ہو آ۔ میں بچی کو کھر رکھ لوں گی۔“ سروش نے مزکر دونوں کی طرف

دیکھا۔

”ارے ارے نہیں آئی!“ مسلمان نے کہا۔ ”بھلا آپ کیوں نہ جائیں۔

میں تو ذرا ناشی کو تکف کر رہا تھا۔“

”نہیں مسلمان! بس موڈ نہیں ہے۔“ اس نے نالنا چاہا۔

”بھئی آئی اموڈ تو عموماً نہیں ہوتا یہ تو بنانا پڑتا ہے۔“ مسلمان نے کہا۔

”بس آپ اٹھ جائیں۔ موڈ بعد میں بنتا رہے گا آرزو پر۔“ نازش نے اسے

بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

مسلمان بھی اصرار کرنے لگا۔ اسے مجبوراً اٹھنا ہی پڑا۔ بے دلی سے تیار ہوئی

اور اس کے ساتھ چل پڑی۔ کالج پختیوں تو بڑی مہما مہمی تھی۔ کافی لوگ آئے ہوئے

تھے۔ پرانی کلاس فیلوؤز کو دیکھ کر برسوں پرانی یادیں تازہ ہو گئیں۔ خوشگوار اور دل خوش کن

یادیں انوکھی شرارتیں وہ بے فکری کے نرالے دن جب کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ کوئی فکر نہیں

تھی۔ زندگی دکھل خوشگوار اور اپنی اپنی سی تھی۔ ایک طویل عرصے بعد ایک دوسرے کو

دیکھ کر بہت خوشی ہو رہی تھی۔

اکثر دھان پان سی لڑکیاں بھاری بھر کم بیگمات میں بدل گئی تھیں۔ نازش اپنی

دوستوں میں محض مل گئی۔ سروش نے بھی دور سے اپنی کچھ کلاس فیلوؤز کو دیکھ لیا تھا۔ قریب

بچنی تو سب نے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھا اور اسے پہچان کر سب نے اسے

ہاتھوں ہاتھ لیا۔

ملنے ملانے سے فارغ ہو کر سب اطمینان سے بیٹھ گئیں تو وہی مقبول عام

موضوع شروع ہو گئے۔ گھر سہراں شوہر اور بچے سروش کو اس قسم کا کوئی خوشگوار یا

”میرا موڈ نہیں۔“ اس نے کروٹ بدلی۔ ”تم ہو آؤ۔“

”واہ موڈ کیوں نہیں۔“ وہ برامانتے ہوئے بولی۔

”بھلا اب میں روز روز آؤں گی۔ چلے اب اٹھ جائیے۔“ وہ اصرار کرنے

لگی۔

آج کالج میں ”اولڈ گرل ڈے“ تھا۔ ان دونوں کے نام بھی دعوت نامہ آیا

تھا۔ سروش تو کبھی اس تقریب میں نہیں جاتی تھی لیکن نازش نے تو دیکھتے ہی اعلان کر دیا

تھا کہ وہ ضرور جائے گی اور اسے بھی ساتھ لے کر جائے گی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی

جو زندگی سے پورا لطف اٹھانا جانتے ہیں۔ اسی لئے وہ صبح سے تیاریوں میں مگن تھی اور

بہت خوش تھی کہ پرانی دوستوں سے ملاقات ہوگی۔

سروش کا دل بچھ سا گیا تھا نہ جانے کیوں دل کے کسی نہاں گوشے میں موبوم

سا احساس ایک مبہم سی امید اب بھی باقی تھی کہ شاید اب بھی عامر کے دل میں اس کی یاد

ہوگی۔ شاید اب بھی اس کا تصور اس کے ساتھ ہوگا۔ شاید وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوگا۔

شاید کبھی زندگی کی راہوں میں اس سے سامنا ہوگا تو وہ اس کے بغیر جیتے ہوئے لمحوں کی

اذیت تک کہانی کہے گا۔ اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر اس کو بھلانے کی کوشش میں اپنی

ہا کا پی تسلیم کرے گا۔ اپنی زندگی کی محرومیوں کی داستان سناے گا۔

لیکن اس کی سردہری سے دل پر قیمت گزر گئی تھی۔ اس قیمت نے اس کی

آنکھوں کے آنسو بھی چھین لئے تھے۔ اس کی کتاب گویائی اس کی آن اس کی انا اس کا

مان بھی کچھ تو اک ہل میں لٹ گیا تھا۔ اس کی جھولی خالی تھی۔ اس کا دامن تار تار تھا۔

”بھئی اس آفت کی پرکالا کو مجھ پر نہ چھوڑ جانا۔“ مسلمان بھی وہیں آ گیا اور

نازش سے ہنسی کے ہارے میں بات کرنے لگا۔

”ایک دن ذرا دیکھ بھال کر لیں گے تو کیا ہو جائے گا۔“ نازش نے پلٹ کر

تا خوشگوار تجربہ نہیں تھا۔ وہ ان کی گفتگو میں شریک نہیں ہو سکتی تھی نہ جانے کیوں وہ کچھ بھینپ ہی رہی تھی۔ اس کے پاس کہنے کے لئے کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ خاموش بیٹھی ان کی باتیں سنتی رہی اور نہ جانے کیا سوچتی رہی۔

عفت نے اسے خاموش دیکھا تو اس کے گال پر چمکی لے کر بولی۔ "ارے سروش کی ہنسی تو کیسی گھنی بنی بیٹھی ہے کچھ تو بول۔"

شمی نے اس کی کمر میں ٹوکا دیا۔ "اے کیسا ہے تیرا میاں وہ اتنی ساربت بیوی کے نخرے اٹھاتے نہیں تھکتا ہوگا۔"

سروش بیٹھنا گئی کہ ان کے جواب میں کیا کہے کہ ساجدہ نے پوچھا۔ "اے سروش کیا نسخہ ہے تیرے پاس، ہمیں بھی اس ساربتیس کا راز بتا دے۔ ہم دیکھ تو کیسے موٹے ہو رہے ہیں کہ چمنا پھرنا دو بھر ہے۔"

وہ پھینکی ہی ہنسی نہیں کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ شائستہ جو اس سے ملتی رہتی تھی جلدی سے بولی۔ "اس کی ساربتیس کا نسخہ تو بس ایک ہی ہے کہ چار پانچ لاکھ کے شہر میں یہ اب تک کھواری ہے۔"

"نہیں۔" سب نے بے چینی سے اس کی طرف یوں دیکھا کہ وہ چوری بنا گئی۔ اسے اپنا آپ بڑا کم مایہ سا معلوم ہوا۔ وہ اس سے بار بار پوچھ رہی تھیں کہ اس نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی۔ اس نے مشکل سے سب کو ٹالا تو سب نے اسے فروافرودا بھیجیں کہیں۔ کچھ نے اپنے شوہر کے دوستوں اور رشتہ داروں کے رشتے بھی پیش کر دیے۔ اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے اس نے زندگی بیکار ہی گزار دی ہے۔

گھر آئی تو طبیعت بہت بوہل تھی۔ وہ بڑی ہی پڑمردہ اور مضوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنا دوستوں کی طرح طرح کی باتوں سے بڑی پریشان ہوئی تھی۔ وہ سب اسے یوں دیکھ رہی تھیں جیسے وہ کوئی مجرہ ہو۔ ان کے اعزاز ان کے لہجے سے ایک ترم آمیز کیفیت

کا اظہار ہوتا تھا۔ بعض کی آنکھوں میں اس نے خلوک و شبہات کے عکس بھی دیکھے تھے۔ ان کی سوالیہ نگاہوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ ایک عجیب سے احساس محرومیت نے اسے خوش و خرم اور کھلتی مٹھل میں بڑا تنہا اور الگ تھلک کر دیا تھا۔

پریشان کن سوچوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ کیا کرے کہاں جائے؟ اس کے چتے ہوئے وجود کے لئے کہیں شہنم ایسی ٹھنڈک اور تازگی نہیں تھی۔

نازش کپڑے بدل کر اس کے پاس آگئی اور محتاط سے لہجے میں بولی۔ "آئی! وہاں سب لڑکیاں کہہ رہی تھیں کہ تمہاری آئی کی شادی اب تک کیوں نہیں ہوئی۔ بڑا عجیب سا لگتا ہے۔ بھلا انہیں کیا بتایا جائے۔ میں نے تو کہہ دیا ہے کہ آئی کی منگنی ہونے والی ہے۔ شادی بھی ہو جائے گی۔"

سروش نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا بات ہے ناشی! فضول میں ہی۔"

"نہیں نا آئی! اب کیا کریں۔ آپ بھی تو کچھ نہیں سوچتیں۔ لوگ خواہ مخواہ باتیں بتاتے ہیں۔ میری مائیں تو بس اب شادی کر ہی ڈالیں۔" وہ پلکیں جلدی جلدی جھپکتے ہوئے بولی۔

"کیا مصیبت ہے؟ یہ شادی شادی۔" سروش نے چڑ کر کہا۔ "کیا اس موضوع کے سوا کوئی دوسرا موضوع نہیں۔" اس نے تھنی سے کہا اور کروٹ بدل لی۔

نازش شاید کچھ دیر اس کے قریب کھڑی رہی پھر چپ چاپ چلی گئی۔



سروش آفس میں بیٹھی کام کر رہی تھی کہ چہرہ اسی نے اطلاع دی کہ اسے کوئی ناتوان ملنا چاہتی ہیں۔

وہ آفس میں اطلاع دے کر صدف کے ساتھ ہی کار میں بیٹھ گئی۔ راستہ بھر دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں نہ جانے کیا سوچ رہی تھیں۔ صدف سارا وقت شیشے سے باہر دیکھتی ہوئی اپنی آنکھیں خشک کرتی رہی۔

گھر پہنچ کر صدف تیزی سے کار میں سے نکلی۔ اس کا بازو پکڑا اور تقریباً بھاگتی ہوئی اسے اندر لے آئی۔ ایک کمرے سے باہر رک کر اس نے سروش کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ سروش متذہب ہی کھڑی رہی تو صدف نے اس کا شانہ ہلایا۔

”کیا سوچ رہی ہیں چلے نا۔“ وہ سرگوشی میں بولی اور اسے اندر دیکھ لیا۔

وہ مبہوت سی وہیں دروازے میں پردہ پکڑے ہوئے کھڑی رہی۔ سامنے ہی چنگ پر عامم ایک کروٹ سے لیٹا تھا۔ قدموں کی آہٹ سے اس نے پلٹ کر دیکھا اور ایک دم اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے پر غوشی کی چمک تھی۔

”زبے نصیب آئیے نا تقریباً لائے۔“

سروش کو اسے دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی۔ وہ کسی طرح بھی ایسا مریض معلوم نہیں ہو رہا تھا جس کی حالت خطرے میں ہو یا جسے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہو۔



”اس وقت کون آ سکتا ہے۔“ وہ یہی سوچتی ہوئی اس کے ساتھ باہر آئی۔ ریسیپشن میں صدف کھڑی تھی۔ وہ اسے یہاں دیکھ کر حیران ہوئی۔

”ارے صدف!“ وہ اس کے قریب آ کر خوشدلی سے بولی۔ ”تم کیسے؟“

صدف نے کچھ بھی نہیں کہا اور اسے گلے لگا لیا۔ سروش نے گھبرا کر اس کا سر شانے سے ہٹایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

”صدف کیا ہوا ہے؟“ اس نے پریشان ہو کر پوچھا۔ نہ جانے اسے کیوں یقین سا ہو چلا تھا کہ وہ کوئی بری خبر لے کر آئی ہے۔

”کچھ بتاؤ تو سہی نا۔“ اس نے پھر پوچھا۔

”میں آپ کو لینے آئی ہوں۔ سروش پلیز میرے ساتھ چلئے۔ دیکھیے انکارن

بچتے گا۔“ وہ لجاوت سے بولی۔

”لیکن کہاں؟“ سروش نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔

”جیسا بہت پیار ہیں سروش! ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ وہ بیہوشی

میں آپ کا نام لیتے ہیں۔ سروش پلیز! آپ ایک بار تو چلئے۔ صرف ایک بار ان کی زندگی کا سوال ہے۔“

سروش شانے میں آ گئی۔ وہ مجبوظ الحواس سی کھڑی تھی مگر اس کا منہ دیکھ رہی

تھی۔ صدف نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ ”سروش!“ خدا کے لئے ان کے لئے نہیں تو میرے لئے صرف میری خاطر۔“

سروش اس کی طرف یوں دیکھتی رہی جیسے خواب کے عالم میں ہو۔ وہ اس

ایک لمحے میں سب کچھ بھول گئی تھی۔ اسے کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ وہ صرف عامم کو پہچان لیا جانتی تھی۔ وہ اسے زندہ دیکھنا چاہتی تھی۔ اس نے صدف کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”چلو

صدف میں پہنتی ہوں۔ ابھی تمہارے ساتھ“

آپ جانے کہ ہم بہت بیمار ہیں۔“ اس نے ہنس کر چٹک کی پشت سے سراگا لیا۔  
سروش کو یقین ہو گیا کہ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا ہے۔ اسے فریب دیا گیا ہے۔  
کسی سوچی سمجھی حکیم کے تحت اسے یہاں لایا گیا ہے۔ اس نے بھی تو صدف کی بات پر  
فورا یقین کر لیا تھا۔ بغیر سوچے سمجھے اس کے ساتھ چل پڑی تھی۔ عام جیسے عیاش آدمی  
کے لئے ایسے بہانے گز لینا کون سا مشکل تھا۔ وہ سہانا گئی۔ کچھ عداوت، کچھ جھنجھلاہٹ  
اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس نے گھور کر ماسم کی طرف دیکھا اور ناگواری  
سے بولی۔

”آپ کو اپنی اس حرکت پر شرم آنی چاہئے۔“

”ہو راقصور؟“ وہ بڑی سادگی سے بولا۔

”قصور۔“ سروش اس کے تھامل مار فائدہ پر جھلائی۔

”یہ کیا تم کھلیا حرکت ہے کہ آپ نے اپنی بیماری کا جھوٹا دھوکہ رچایا ہے۔“

مجھے جھوٹی اطلاع دینی ہے۔ میں تو آپ جیسے انسان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی۔“

وہ غصے سے ہلکی چلی گئی۔ ”پتہ نہیں آپ اپنی ان حرکتوں سے ہانکیوں نہیں

آ جاتے۔ میرا بیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ آپ دوسروں کی عزت کو اتنا سستا کیوں

سمجھتے ہیں۔“

وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

”سنئے میری بات سنئے۔“

”نہیں سننا ہے مجھے کچھ۔“ اس نے تھلا کر اس کا ہاتھ جھٹکا۔

”میں جاری ہوں۔“

”آپ نہیں جائیں گی۔“ وہ تھکسانہ لہجے میں بولا۔ ”جب تک آپ کی غلط

فہمی دور نہیں ہو جاتی آپ نہیں جائیں گی۔“

وہ کچھ الجھی گئی۔ بچے تلے قدم رکھتی۔ اس کے ہسٹک آگئی اور آہنگی سے

بولی۔ ”آپ کو آرام کرنا چاہئے۔“ وہ اس کی طرف بڑے نور سے دیکھ رہی تھی۔

”کیوں؟ مجھے کیا ہوا؟“ ماسم نے دلچسپی سے پوچھا اور اس کی طرف ہنستی

ہوئی نظروں سے دیکھا۔ سادہ سی پھولدار ساڑھی میں وہ ابھی ہوئی سی کٹڑی بہت ابھی

لگ رہی تھی۔ ماسم نے مسکرا کر کہا۔ ”میں اس گفتگو کو کیا سمجھوں۔“

سروش نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تو اچھا بھلا سندرست

بیٹھا۔ بڑے مزے سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کا ہٹک یقین میں بدلنے لگا۔ وہ ایک قدم

آگے بڑھی اور طہریہ سے لہجے میں پوچھنے لگی۔ ”آپ کی تو طبیعت بہت خراب تھی۔“

”میری طبیعت؟“ اس نے حیرانی سے استفسار کیا۔

”جی ہاں آپ کی طبیعت۔“ سروش نے اسی لہجے میں جواب دیا۔

”کس نے کہا آپ سے؟“ وہ پوچھنے لگا۔

”صدف نے۔“

”اچھا؟“ وہ بولا پھر جیسے خود سے کہنے لگا۔ ”صدف نے آپ کو بتایا کہ میری

طبیعت خراب ہے۔“ اس نے ایک لمحے کو سوچا اور پھر جیسے بڑا مظلوم ہوتا ہوا بولا۔

”میری بہن نے کہا ہے تو پھر انہوں نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ آپ کا یہ گفتگو یہ

نوازشات حاصل ہوئیں تو میں زندگی بھر ہسٹ پر پڑنے کو تیار ہوں۔“ وہ مسکرایا۔ ”لیجئے

”آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ میں ابھی جاؤں گی۔“ اس نے غصے سے کہا۔  
وہ اس صورت حال سے بہت پریشان ہو رہی تھی۔

”آپ میری بات سنے بغیر نہیں جا سکتیں۔“ عامم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا  
اور اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک کرسی پر دھکیل دیا۔ اس کے کسی ردعمل کا انتظار کئے بغیر  
بولا۔

”آپ یقین کیجئے کہ مجھے اس کی مطلق خبر نہیں کہ صدف نے آپ سے کیا  
کہا؟ کیوں کہا؟ نہ ہی مجھے اس قسم کی غلط بیانی پسند ہے۔ لیکن آپ مجھے اتنا بتائیے کہ  
آپ اس شخص کی مزاج پر ہی کو کیوں چلی آئیں جس کی آپ صورت بھی نہیں دیکھنا  
چاہتیں۔“

سروش کو اس کی توقع نہیں تھی۔ ایک لمحے کو وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ لیکن اس پر  
کچھ ظاہر کئے بغیر روشنی سے بولی۔ ”مجھے صدف نے مجبور کیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آپ  
کی حالت خطرے میں ہے۔“ اتنا سا فقرہ مکمل کرنے میں وہ بانپ گئی۔ صدف نے ہی  
مجھے مجبور کیا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ آپ کی زندگی کا  
سوال ہے۔ آپ۔ آپ۔ آپ بے ہوشی میں میرا نام لیتے ہیں۔“ وہ یوں جلدی جلدی  
بول رہی تھی جیسے کوئی کچا چوراہی صفائی میں جمونے بہانے گھڑ رہا ہو۔

”چہ خوب؟“ عامم کھل کر مسکرایا۔ ”صدف نے کہا کہ میں بے ہوشی میں  
آپ کا نام لے رہا ہوں اور آپ پھر بھی چلی آئیں۔ سروش آپ نے یہ نہیں سوچا کہ  
عالم نزع میں مریض کا کسی خاتون کا نام پکارنا کتنا مہیوب ہے؟“

اس کے منہ اڑانے پر وہ تھملا اٹھی۔ ”آپ میرا مذاق نہیں اڑا سکتے۔“

”یہ مذاق نہیں حقیقت ہے۔“ وہ بڑے یقین سے بولا۔ ”یقیناً آپ کو ناگوار تو  
گزر رہا ہوگا کہ میں مرتے مرتے بھی آپ کا نام لینے سے باز نہیں آتا تو پھر بھی آپ چلی  
آئیں ہے نا عجیب بات۔“

سروش کے رگ دپے میں سسکی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ اس نے اس پہلو سے تو  
سوچا ہی نہیں تھا۔ یہ معلوم اندیشے سے وہ لرز گئی۔ عامم اس کے قریب چلا آیا۔ ”سروش“  
سروش آج تو نام لہجے آج تو افراد کر لیجئے کیوں خود پر جبر کرتی ہیں۔ یاد ہے سروش اس  
کمرے میں داخل ہونے وقت آپ کس قدر پریشان تھیں۔ کوئی کسی کے لئے یونہی تو  
پریشان نہیں ہوتا۔“

سروش کے لئے صورت حال کا مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ اس کے سامنے کھڑے  
ہوئے عامم کی آنکھوں سے پھٹکتے غلوں پر اعتماد کر لینے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن دل کی  
بدگمانیاں روکتی تھیں۔ وہ شاید کوئی نئی چال چنے والا تھا۔ کوئی نیا کھیل کھیل رہا تھا۔ اسے  
چنگیزی صاحب کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ اس پر اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے دل  
میں اتر جانے والی نظروں سے لگا ہیں ہر ایلین اور سپاٹ لہجے میں بولی۔ ”مجھے آپ کی  
یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔ میں یہاں آئی تھی تو محض رسماً اور وہ بھی صدف کی خاطر  
آپ کو کسی غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”آپ سچ کہہ رہی ہیں۔“ اس نے بے حد سنجیدگی سے پوچھا۔ ”مجھے جھوٹ  
بولنے کی عادت ہے نہ اس کی ضرورت۔“ وہ لا تعلقی سے بولی۔ عامم نے ایک دم اسے  
دونوں شانوں سے پکڑ لیا اس کا چہرہ اوپر اٹھا کر بولا۔ ”سروش آپ یہ سب کچھ لگا ہیں  
جھکا کر کیوں کہہ رہی ہیں۔“

”مجھے مت چھوئے۔“ سروش نے نفرت سے اس کے ہاتھ جھٹک دیئے اور  
اس سے دور ہٹ گئی۔ ”میں کوئی سوسائٹی گرل نہیں ہوں عامم صاحب اس بار آپ کو

آپ کی مہاشیوں میں حصہ دار نہیں بن سکتی۔ میں'

"سروش!" عام نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ آپ مجھے مجبور کر رہی ہیں کہ میں ان باتوں کا تذکرہ کروں جنہیں میں زبان پر لانا گوارا نہیں کرتا لیکن آپ کہلوانے بغیر نہیں رہیں گی۔ تو سنئے وہ چنگیزی صاحب مجھے بھی مل چکے ہیں اور انہی کا دعویٰ ہے کہ آپ ان سے وابستہ رہ چکی ہیں اور وہ چند لمبے ماموش ہوا۔

سروش نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کہتا گیا انہوں نے عدنان صاحب اور کچھ دوسرے لوگوں کا نام بھی لیا تھا۔ سروش ایسی اور بھی بہت سی باتیں ہیں جن کا میں ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ اس کے قریب آگیا اور مفاہمت کے انداز میں بولا۔ "مجھے دوسروں سے زیادہ اپنے دل پر اکتاہ ہے۔ مجھے کوئی آپ سے بدگمانی نہیں کر سکتا۔ سروش آپ کو مظلوم ہے کہ چنگیزی صاحب میرا کے قریبی حلقے میں سے ہیں۔ وہ خاص طور پر آپ کے لئے اس آفس میں بیٹھے گئے کہ ایسی اسٹاف ممبریاں پیدا کریں۔ مجھے بہت افسوس ہے کہ آپ کو میری وجہ سے اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑا۔"

"سروش! کیا مجھے آپ معاف نہیں کریں گی؟"

سروش جو ستانے کی ہی کیفیت میں عام کی بات سن رہی تھی چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ "سروش اپنا دل صاف کر لیجئے۔ چلیز بدگمانیاں دور کر لیجئے جو کچھ ہوا وہ میرا صاحب کی عنایت تھی۔ لیکن اب ان کی طرف سے بے فکر رہیے۔ وہ ایک دیکس سے شادی کر چکی ہیں۔ ہمارے پیچھے ہی یورپ آئی تھیں۔ ملاقات ہوئی تھی۔"



انتخاب میں غلطی ہوگئی۔ میں مجیزہ جیسے میں سچا موتی نہیں ہوں۔ میں ایک شریف لڑکی ہوں۔ میں آپ جیسے لوگوں کے ہاتھ میں کھوٹا نہیں بن سکتی۔"

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" عام نے اسے جھنجھوڑ دیا۔ "میں نے آپ کو پورے غلوں سے چاہا ہے سروش!"

"جی ہاں۔" سروش نے عقارت سے کہا۔ "آپ نے چنگیزی صاحب سے بھی میرا تعارف اسی طرح کرایا ہوگا۔ تبھی وہ میری اداؤں پر مرئے تھے۔ وہ مجھ سے فیض پانا چاہتے تھے۔ وہ آپ کے ذوق کی داد دے رہے تھے۔" اس نے ہونٹ دانتوں سے کاٹ لیا۔ انہوں نے انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا وہ مجھے ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے میں بری لڑکی ہوں۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا ہے۔ مامم صاحب غم و غصے کی شدت میں وہ رو پڑی۔ "آپ نے مجھے کہیں کانٹیں رکھا۔ آپ نے مجھے ذلیل کیا ہے آپ نے۔" آپ کی تو دل لگی ہوگئی اور میری زندگی تباہ ہو جاتی تو میں کسی کوٹ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔"

عام بہت سا بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنسنا مسرت سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ آہستگی سے اس کے قریب چلا آیا اور رک رک کر بولا۔ "سروش مجھے یقین نہیں آتا کہ آپ جو کچھ کہہ رہی ہیں۔ وہ سچ ہے۔ میں اپنی صفائی میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آپ کی عزت میری عزت ہے۔"



سروش کا حصہ سرو نہیں ہوا تھا۔ اسے پھر وہ تمام واقعہ یاد آ گیا تھا۔ وہ عام کو کبھی معاف نہیں کر سکتی تھی۔ ٹھک کر یولی۔ "وہ تو آپ کی فیاضی کی بڑی تعریف کر رہا تھا۔ آپ کا بھرم کھل گیا ہے عام صاحب! آپ کا کچا جھٹا مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ مگر

سرور اہنی پریشان بھی نہیں ہوئی تھی۔ جذبات کی دنیا بھی اتنی عجیب و غریبہ اور ناواقف نہیں ہوتی تھی۔ لہجوں کی بھول بھلیوں میں وہ جیسے بھٹکتی پھرتی تھی۔ لیکن کوئی راستہ نہیں ملتا تھا۔ اس کی انا کی چٹان اس کی راہ میں مائل تھی۔ خودداری کی سنگین دیواریں اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھیں۔ وہ اپنے پنے ہوئے راستے پر سر اٹھا کر چلنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ بار بار اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا تھا۔

اس بات کو کئی روز تو گئے تھے۔ لیکن ابھی تک ذہن سے نہیں اترتی تھی۔ عامم کے سیدھے سادھے لفظ بار بار دماغ میں چمکاتے تھے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے؟ کس سے بات کرے؟ کس کی بات پر یقین کرے؟ اور کس کو جھٹلا دے؟ ہر طرف وحشی چھالی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

اپنا تک ایک روز رضی بھیا آگے اور اس کی طرف دیکھ کر بولے۔ ”بہت دن ہو گئے تھے تم سے ملے ہوئے۔ سوچا ذرا جا کر دیکھ آؤں کہ ایک سر پھری لڑکی کیا کر رہی ہے۔ جس کے منہ پر بارہ بچا رہے ہیں۔“

سرور غصے پڑی۔ ”یونہی نہ کہا کریں رضی بھیا!“

”یونہی نہیں کہہ رہا۔ یہ بات سو فیصد درست ہے۔“

”کیا بات؟“ سرور نے پوچھا۔

”کہ اب تمہارے منہ پر ساڑھے بارہ بچے گئے ہیں۔ ویسے مذاق کی بات اور

ہے مگر کچھ پوچھو تو واقعی تم پریشان لگ رہی ہو۔ خیریت تو ہے ان؟“

”سب خیریت ہے جناب! میں بالکل پریشان نہیں ہوں۔“ وہ جلدی سے

بولی۔ ”ویسے ہی کچھ بوریٹ سی ہو رہی تھی۔ اچھا ہوا آپ آگے۔“

آپ کے بارے میں انہوں نے بہت کچھ کہا۔ مگر خیر چھوڑیے۔ ان باتوں کو اور یہ سوچنے کو اس تمام بے ضرر سے جھوٹ میں جو بات سب سے اچھی ہے۔ وہ یہ کہ دلوں کے رابطے ان کے بعد صحت سے کچھ نہیں ہوتے کہ پل بھر میں ٹوٹ کر ٹکڑے ہو جائیں۔ کوئی بات تو تھی ان جو آپ کو یہاں تک لے آئی۔“

سرور اس کی مسکراہٹ دیکھنے والی نگاہوں سے جھٹکتی جاتی تھی۔ وہ چند قدم قریب آیا اور اس کی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر اس کا جھٹکا ہوا گلہابی چہرہ اور پر اٹھاتے ہوئے بولا۔ ”سرور اپنے دل کی بیماری ہی بات مان لیجئے۔“ اس کا مٹھا ملائم لہجہ اس کی دل میں جھانکتی نگاہیں سرور کو عجیب استخوان میں ڈال رہی تھیں۔ لیکن انکار کو اقرار میں بدلنے جیسے زندگی موت کا سوال بن گیا تھا۔ راہ میں اس کی خودداری اس کی عزت نفس مائل تھی۔

متضاد جذبات کی یورش سے وہ گھبرا سی گئی۔ سر جھٹک کر وہ جیسے خود سے بولی۔ ”نہیں..... میں اعتبار نہیں کر سکتی!“

اس کی اپنے آپ سے یہ سرورشی عامم نہیں سن سکا۔ اس نے سواہد نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پلیز اچھے جانے دیں۔“ سرور نے ہنسنے کہا۔ اسے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک پل بھی یہاں رک گئی تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ عامم نے کچھ نہیں کہا۔ چند لمبے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے لے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولے سے بولا۔ ”آپ جانا چاہتی ہیں تو شوق سے جا بیجئے۔ لیکن آپ میری زندگی سے میرے دل سے کبھی نہیں گل سکتیں۔“

رضی بھیا! جو خاموشی سے یکطرفہ گفتگو سن رہے تھے۔ جلدی سے بولے۔  
 ”سروش! کیا معاملہ ہے؟ یہ ڈاکٹر عادل کون ہیں اور یہ عام صاحب کون ذات شریف  
 ہیں۔ یہ کیوں بار بار بہانے بناتے ہیں؟“

سروش ابھی کچھ کہہ نہیں پائی تھی کہ فون کی گھنٹی بج گئی۔ سروش کو یقین تھا کہ  
 فون ڈاکٹر عادل کا ہی ہوگا۔ وہ اتنی آسانی سے نلتے والا نہیں تھا۔

”مس سروش! میں ایک ذمہ دار ڈاکٹر کی حیثیت سے آپ کو یہ بتانا اپنا فرض  
 سمجھتا ہوں کہ عام کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ کو آنا چاہیے۔“

”شکر یہ اطلاع دینے کیلئے۔“ سروش نے منتقلی سے کہہ کر ریسیور رکھنا چاہا  
 لیکن اس سے پہلے ہی رضی بھیا نے ریسیور اس کے ہاتھ سے چھپٹ لیا اور جلدی سے  
 بولے۔

”ہاں بھئی! آپ کون صاحب ہیں۔ مجھے بتائیے کہ اصل معاملہ کیا ہے۔  
 بد قسمتی سے میں اس بیوقوف لڑکی کا سر پرست بھی ہوں۔“

سروش فون بند کرنے کو چھٹی لیکن رضی بھیا نے اسے پرے دھکیل دیا اور  
 ریسیور میں چلائے۔ ”بھئی یہ سروش مرنے مارنے پر تکی ہوئی ہے۔ آپ ذرا جلدی  
 بتائیے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔“

سروش کا بس نہیں چلا تو وہ خاموش ہو گئی اور وہ فون پر بات کرتے رہے۔ پھر  
 انہوں نے ریسیور رکھا اور سروش سے بولے۔ ”سروش! چلو اٹھو۔ میرے ساتھ چلو۔  
 ڈاکٹر عادل کہہ رہے ہیں کہ یہ مذاق نہیں ہے۔“

”مجھے سب پتہ ہے۔ رضی بھیا! میں نہیں جا رہی۔“ وہ ایک مرتبہ پھر حفاقت  
 کر کے شرمندہ نہیں ہونا چاہتی تھی۔

”ارے بھئی! انکی بھی کیا بات ہے۔ اگر جھوٹ ہو تو ہم ڈانٹ ڈپٹ کر کے

”تم بور ہو رہی تھی۔“ انہوں نے ابرو اچکائے۔ ”کیا بات ہے سروش! یہ تم  
 بور کیوں ہونے لگی ہو؟“ انہوں نے معنی خیز لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلا آپ کبھی بور نہیں ہوتے؟“

”میری بات اور سے لڑکی! میں تو شادی شدہ ہوں۔“ انہوں نے برجستہ کہا۔  
 سروش کو بہت ہنسی آئی۔ وہ جو اب کچھ کہنے ہی والی تھی کہ فون کی گھنٹی بجی۔ اس

نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھایا۔ ”ہیلو“

”ہیلو سروش! صاحب سے بات کرنی ہے۔“ کسی مردانہ آواز نے کہا۔

”جی فرمائیے بول رہی ہوں۔“ وہ آواز پوچھان نہیں پائی۔

”سروش! سنئے! میں ڈاکٹر عادل بات کر رہا ہوں۔ عام کا دوست شاید آپ کو  
 یاد ہو۔ بہر حال آپ فوراً ہاسپتال پہنچیں۔ عام کا ایکسٹنٹ ہو گیا ہے۔ حالت کچھ امید  
 افزا نہیں۔“ اس نے امریزی میں جلدی جلدی کہا۔

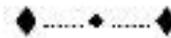
سروش یکدم چوکی۔ وہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسے خاموش پا

کر وہ دوسری طرف سے پھر بولا۔ ”مس سروش! آپ میری بات سن رہی ہیں نا۔“

فورا بچنے کی کوشش کیجئے۔ کچھ دیر پہلے اسے ہوش آیا تھا۔ اس نے آپ کو بلانے کیسے کہا  
 ہے۔“ سروش اس کی بات پر غور کرتی رہی۔ اسے صدف کی شرارت ابھی بھولی نہیں تھی۔

یہ ڈاکٹر عادل تو اس سے بھی دو ہاتھ آگے تھا۔ اب وہ اپنے حربے آزمانے پر تیار کیا تھا۔  
 اسے غصہ آیا لیکن وہ قدرے نرمی سے بولی۔ ”ڈاکٹر عادل! جناب عام صاحب سے

کہہ دیجئے کہ ایک ہی بہانہ بار بار نہیں چلے گا۔ اب کوئی اور کہانی گھڑیں۔“ اس نے  
 ریسیور رکھ دیا۔



یہ خیال ہی لرزادینے والا تھا۔ بے اختیار اس کا جی چاہا کہ اسی وقت بنا کچھ سوچے بغیر کوئی خیال کئے بغیر اس کے پاس چلی جائے۔ ایک بار اسے بتا تو دے کہ وہ اس کے جانے پر چلی آئی ہے۔ لیکن قدم اٹھانا محال تھا۔ سو طرح کے دوسوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ وہ چلی جائے تو سب لوگ کیا کہیں گے۔ اس کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

وہ گوٹو کی کیفیت میں اسی طرح کھڑی تھی کہ دروازہ کھول کر رضی بھیا اندر آئے۔ سروش کی روح آنکھوں میں سمٹ آئی۔ باوجود چاہنے کے وہ کوئی استفسار نہیں کر پائی۔ وہ بغیر کچھ کہے وہ اس کے قریب آئے۔ انہوں نے اس کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ہمراہ لے کر چلتے ہوئے بولے۔ "چلو آؤ سروش" میں ڈاکٹر عادل کی گاڑی لے کر آیا ہوں۔ وہ شخص مر رہا ہے اور تم پتہ نہیں کون سے بدلے چکانے بیٹھی ہوئی ہو۔ اب ایسی بھی بے حسی کیا کہ انسان کو کسی کا کوئی پاس لحاظ ہی نہ ہو۔"

سروش انکار نہ کر سکی اور ان کے ساتھ ساتھ چلتی چلی گئی۔ ہوسپتال میں صدف ان کی والدہ اور دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ پریشان کھڑی تھی وہ دوڑ کر اس کے قریب آئی اور زندگی ہوئی آواز میں بولی۔ "سروش! میں نے تو جھوٹ بولا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس طرح بچ ہو جائے گا۔"

سروش کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ تسلی کیلئے ایک بھی لفظ اس کے ہونٹوں سے نہیں نکلا۔ رضی بھیا نے صدف سے معذرت کی اور بولے۔ "آؤ سروش! ذرا عاصم صاحب کو دیکھتے ہیں۔"

سروش کو گرد و پیش کچھ بھی صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کا دل بیٹھا جاتا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف عاصم تھا۔

وہ جیسے ہی اس کے کمرے کے باہر پہنچے۔ ڈاکٹر عادل دروازہ کھول کر باہر نکلا

واپس آ جائیں گے۔ بس اتنی سی تو بات ہے۔" انہوں نے پھر اٹھنے کا اشارہ کیا۔  
"رضی بھیا! میں نے کہہ دیا ہے کہ میں نہیں جاؤں گی۔"  
"لیکن میں ضرور جاؤں گا۔ پتہ تو چلے کہ آخر بات کیا ہے۔ تم بھی چلو ساتھ! ایسا نہ ہو کہ بعد میں پچھتانا پڑے۔" وہ اٹھ کر چل پڑے۔



سروش کے اندر عجیب کشش ہی ہونے لگی۔ یہ رضی بھیا نے کیا کہہ دیا تھا۔ کہیں اسے پچھتاہ تو نہیں پڑے گا۔ یہ بات اس کے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ اسے بار بار یہ خیال آ رہا تھا کہ اگر عاصم کو کچھ ہو گیا تو پھر؟  
عجیب گوٹو کے عالم میں کبھی وہ ٹپکتے تھی۔ کبھی کھڑکی سے باہر جھانکتی اور کبھی خاموش ٹیلیفون کی جانب بٹکتے تھی۔ کسی پلہ چین نہیں آ رہا تھا۔ کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اچانک اسے ایک خیال آیا اور اس نے ریسیور اٹھا کر عاصم کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف کسی نے نیلو کہا تو اس نے جلدی سے پوچھا۔ "عاصم صاحب سے بات ہو سکتی ہے۔"

"جی وہ تو ہوسپتال میں ہیں۔ ان کا ایکٹیوٹ ہو گیا۔" دوسری جانب کوئی ملازم تھا۔

ریسیور اس کے ہاتھ سے چھوٹے چھوٹے رہ گیا۔ وہ وحشت زدہ دل لے کتنی ہی دیر بالکل چپ کھڑی رہی۔ ایک ایک کر کے عاصم کی ساری باتیں یاد آنے لگیں۔ لفظ فیملیوں نے دونوں کے درمیان فاصلے بڑھائے تھے اور وہ اپنا محرمیوں کا انتقام اس سے لیتی رہی تھی۔ "اگر اسے کچھ ہو گیا تو؟"

جان دے کر بھی اسے بچا لینا چاہتی ہے۔" لیکن کوئی منجور نہیں ہوا۔ وہ اسی طرح آنکھیں موندے ساکت پڑا رہا۔ اس کی پک تک نہیں ملی۔

ڈاکٹر عادل نے اس کا شانہ چھو کر اسے اشارے سے واپس چلنے کو کہا۔ وہ چونک گئی اور حیرت سے یوں اس کی طرف دیکھنے لگی جیسے اس نے کوئی انسانی بات کہہ دی ہو۔

ڈاکٹر عادل نے آہستگی سے کہا۔ "آجائے مس سرش"

سرش کی آنسو بھری آنکھوں نے بے ساختہ ایک خاموش التجا کی تو ڈاکٹر عادل نے سر ہلایا اور نرم قدموں سے باہر نکل گیا۔

سرش وہیں کھڑی عاصم کے زرد تیار چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پتہ نہیں کیوں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے زندگی میں کچھ رہا ہی نہیں نہ کوئی آرزو نہ تمنا نہ کوئی دعا نہ مال نہ جینے کی خواہش نہ زندگی کرنے کی چاہیوں لگتا تھا جیسے سب کچھ عاصم کے ساتھ ختم ہونا جا رہا تھا۔ وہ تری ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ شاید اس کی تصویر آنکھوں میں بھر لینے کو۔

اچانک عاصم کی پلکوں میں جنبش ہوئی۔ اس نے آہستہ بہت آنکھیں کھولیں اور اس کی نگاہ سرش تک آئی۔ "سرش!" اس کے لب بے۔

سرش دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجبورہ روٹنا ہو گیا تھا۔ جس کے لئے اس نے دل کی گہرائیوں سے دعا مانگی تھی۔ "سرش! آپ یہاں یہ کہیں کوئی خواب تو نہیں ہے۔" وہ مضطرب سی مسکراہٹ کے ساتھ رک رک کر بولا۔

سرش بول نہیں پاری تھی۔ وہ اب بھی ساکت ہی کھڑی اس کی طرف ایک تک دیکھتی جا رہی تھی۔ دو ساتوں جیسے شفاف آنسو اس کے گلابی رخساروں پر ڈھلک

اور نظریہ سے لہجے میں بولا۔ "تو آپ کو آخراں کی حالت پر دم آئی گیا۔"

"کیا میں انہیں دیکھ سکتی ہوں۔" اس نے کانپتے لبوں سے اتنا ہی کہا۔

"اب کیا فائدہ اب اس کے لئے صرف دعا کیجئے دعا۔" وہ خشکی سے بولا۔

سرش کی آنکھوں میں آنسو آپ سے آپ آئے جاتے تھے۔ جنہیں وہ بڑی کوشش سے روک رہی تھی۔ آنسوؤں کا ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر اس نے آہستگی سے کہا۔

"پلیز ایک منٹ کیلئے مجھے دیکھ لینے دیجئے۔"

ڈاکٹر عادل نے سر جھٹکا۔ "آپ نے بہت وقت ضائع کیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں

وہ کب ہوش میں آئے یا۔" اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

سرش کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ ہر اسان ہی ہو کر پیچھے ہٹ گئی اور دیوار سے ٹیک لگا کر گم گم کھڑی ہو گئی۔ رضی بھائی نے ڈاکٹر عادل سے کہا۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ سرش کو دیکھنے تو بیٹھے تے۔"

ڈاکٹر عادل نے کچھ سوچ کر کہا۔ "اچھا چلے آجائے۔"

لیکن وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی۔ جیسے کچھ شای نہ ہو۔ رضی بھائی نے

اس کا شانہ چھوا۔ "سرش! آؤ چلے ہیں۔"

"نہیں رضی بھیا اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ کھوئی کھوئی سی بولی۔

"نہیں نہیں آجائے۔" ڈاکٹر عادل نے نرمی سے کہا اور کمرے کا دروازہ

کھول کر اسے اندر لے آیا۔

عاصم سفید ٹیڈوں میں جکڑا ہوا بستر پر خاموش پڑا تھا اس کا چہرہ زرد اور

آنکھیں بند تھیں۔ وہ اس کے بندے کے پاس ہی کھڑی سوچتی رہی۔ "کاش وہ ایک بار

آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ وہ آگئی ہے۔ وہ اس کے لئے کتنی پریشان ہے۔ وہ اپنی

”اوہ۔“ وہ شپٹایا۔ ”مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا۔“ آپ یقین نہیں کریں گی۔ میں نے عادل کو منع بھی کیا تھا۔ لیکن اس نے اور صدف نے میری ایک نہیں سنی۔“

سروش پوری جان سے جل گئی۔ اسے بے طرح اپنی توہین کا احساس ہوا۔ وہ ایک بار بھران کے ہاتھوں بیوقوف بن گئی تھی۔ وہ پھر اپنے ہی جذبوں سے ہار گئی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ اس بچوں میں جکڑے ہوئے شخص کو کوئی ماروے جس نے اسے اپنی ہی نگاہوں میں حقیر کر دیا تھا۔ وہ جو اب سے چند لمحے پیشتر اسے زندہ دیکھنے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار تھی اب اس کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

اس نے دانت بیس کر اس کی طرف دیکھا۔ ”عاصم صاحب اب آپ مر بھی جائیں گے تو میں کبھی نہیں آؤں گی۔“ غم و غصے کی شدت میں وہ بات بھی مکمل نہ کر سکی۔ اور ہیچنتی ہوئی دروازے کی طرف چلی۔

”سروش! سروش! بات تو سنئے۔“ عاصم نے کئی بار پکارا لیکن سروش نے مزہ کر بھی نہیں دیکھا۔ ابھی وہ دروازہ کھولنے نہیں پائی تھی کہ دروازہ کھلا اور ڈاکٹر عادل کا چہرہ دکھائی دیا۔

”ارے مس سروش! آپ کہاں چل دیں۔“ وہ اس کے سینہ مقابل اُٹن رکا۔ سروش نے نلرت سے منہ پھیر لیا۔

آئے تھے محروہ ان سے بے خبر تھی۔

”سروش! عاصم نے پکارا۔“

تو وہ جیسے ہوش میں آگئی۔ اس نے غور سے عاصم کی طرف دیکھا۔ اسے شک ہونے لگا۔ ڈاکٹر عادل نے تو کہا تھا کہ اس کی حالت خطرے میں ہے۔ اسے اب ہوش نہیں آئے گا۔ اس کے لئے صرف دعا کی ضرورت ہے۔ لیکن اس وقت وہ آنکھیں کھولے اس کی جانب بکتا ہوا اتنا بھی بیمار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ جس کی جان کے لالے پڑے ہوئے ہوں۔

یہ خیال ایسا تھا جس نے اسے پوری جان سے جلا کر رکھ دیا۔ بالکل چلتے سکتے جذبات یکدم سرد پڑ گئے۔ اس نے ایک قدم قریب آ کر سچیں لہجے میں اس سے سوال کیا۔ ”عاصم صاحب! کیا واقعی آپ کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے یا یہ کوئی ڈرامہ ہے۔“





سروش کو اس سے بچھا چھڑانا مشکل ہو گیا تھا۔ اس پر نصیب یا علامت کا اثر ہی نہیں ہوتا تھا۔ سروش اس قدر زچ ہو رہی تھی کہ اسے روٹا آ رہا تھا۔ اس نے عادل کا بازو جھٹکنا چاہا۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ لگا رہا اور اسے عام کے بیڈ کے قریب لے جا کر بولا۔

”دیکھئے ناس سروش! یہ کھانسی کا مرض سخت جان ہی اتنا ہے کہ ابھی تک نہیں مرا۔ ورنہ جس قدر یہ زخمی ہے اب تک تو اسے اگلے جہان سدھار جانا چاہیے۔ ویسے بھی اسے ایک ڈاکٹر کی رائے کا احترام کرنا چاہیے۔“

سروش نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور دوشنی سے بولی۔ ”عادل صاحب میں آپ کی کسی بات پر یقین نہیں کر سکتی۔ مجھے آپ پر بالکل اعتبار نہیں ہے۔“

”ہوں اعتبار نہیں بالکل۔“ وہ مسکرایا۔ ”چلے پھر میں آپ کو اس کے ایکس ریز دکھاؤں کہ اس کی کوئی ہڈی سلامت نہیں۔ صبح سے چار بوتل خون اسے پڑھا چکا ہوں۔ ایک آدھ بوتل خون آپ بھی دے دیں تو بڑی صبر پائی ہوگی۔ گرد پ کوئی سا بھی ہو یہ بڑی خوشی سے قبول کرے گا۔“

سروش نے الجھ کر عام کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد اور مضطرب تھا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جلدی سے بولا۔ ”میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ آپ کو پریشان نہ کرے۔ لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ مجھے خند کی دوا دے دی اور آپ سے نہ معلوم کیا کچھ کہتا رہا۔ سروش مجھے افسوس ہے کہ ان لوگوں نے آپ کو پریشان کیا۔“

”اس نے زک زک کر اپنی بات مکمل کی۔ تختہ ہت سے اس کا سانس بھول گیا تھا۔“

”بت جا رہے عادل صاحب! مجھ سے بات مت کیجئے۔“ اس نے عمارت

سے کہا۔

”عادل! انہیں روکو یہ فوٹو گرافی رہی ہیں۔“ عام نے نسبتاً جلد آواز میں کہا۔ لیکن اس میں ثقاہت کی لڑوش تھی۔

”ارے ہاپ ارے۔“ عادل اس پر پھرتی ست پلٹ کر دروازے پر جا کھڑا ہوا کہ عام اس کی لڑاکائی پر زور سے ہنس پڑا۔ سروش کو اور غصہ آیا۔

”ہم تو کسی صورت نہیں جانے دیں گے۔“ وہ دروازے سے پشت لگانے سے باز رہنے سے کہہ رہا تھا۔

”عادل صاحب! مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں ہیں۔“

سروش نے تیزی سے ہٹ کر کہا ”راستہ دیجئے مجھے۔“

”سروش! سروش! میری بات تو سنیے۔“ عادل نے بیٹے سے پیار سے اس کا بازو پکڑا۔ ”آپ ناراض کیوں ہیں اتنی۔ آخر ہوا کیا ہے۔ مجھے بتائیے تو سہی، کسی مریض کی عیادت کو آنا کوئی اتنی بری بات تو نہیں۔“ اس کی زبان سب عادت رک نہیں رہی تھی۔ وہ اسے کمرے کی طرف لے چلا۔

سروش زچ ہو گئی۔ اس نے حصار کر اپنا بازو چھڑایا۔

”عادل صاحب! آپ مجھ سے بالکل بات نہ کریں میں جا رہی ہوں۔“

”ارے نہیں، نہیں!“ عادل نے بڑی بے تکلفی سے پھر اس کے بازو میں ہاتھ ڈال دیا۔ ”میں بھلا آپ سے بات کیوں نہ کروں؟ میں نے کیا تصور کیا ہے بھلا؟ میں ایسے ہی مفت میں مارا جاؤں۔ اتنا کلم بھلا کیا کرنا ہوا۔ وہ منہ بنا کر کہہ رہا تھا۔“

تک آئی۔ تھوڑا سا جھکی اور تیزی سے بولی۔ ”ہاں میں ناراض ہوں۔ ناراض ہوں۔ بہت ناراض ہوں۔“

عاصم نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس پڑی اور ہولے سے بولی۔ ”میں بہت ناراض ہوں آپ سے۔“

اس کا دلکش چہرہ گمنام ہوا جاتا تھا۔ اس نے گلالی ہونٹوں کا ایک گوشہ دانتوں تلے دبا لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی جھل جھل کر رہی تھی۔

”اچھا تو آپ بہت ناراض ہیں۔ عاصم بے ساختہ ہنس دیا۔“ تو ناراض رہیں۔ ہمیں سنا آتا ہے۔“

سروش نے چپکتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور شرمناک رخ پھیر لیا۔

(شتم شد)

”مس سروش! مجھے بھی انہوں ہے کہ پتہ نہیں آپ سے کیا کہتا رہا ہوں۔ دراصل میری یادداشت بہت کمزور ہے۔“ وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔ تو سروش شپٹا گئی۔ کہ کس کی بات پر یقین کرے۔ اور کس پر نہ کرے۔ اسے تذبذب میں دیکھ کر عادل سنجیدہ ہو گیا اور بڑی بردباری سے کہنے لگا۔ ”سروش آپ یقین کریں اس کا واقعی زبردست ایکٹیوٹ ہوا ہے۔ یہ پٹیاں وغیرہ سچ سچ کی ہیں۔ البتہ خطرناک والی حالت میں نے گڑھی تھی۔ میں چاہتا تھا سروش کہ آپ اپنے بارے میں جان لیں۔ خود کو سمجھ لیں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ شخص ہے تو ہاں مقول۔ لیکن آپ کو کتنا عزیز ہے۔“

سروش گوگھو کے عالم میں اس کی طرف دیکھتی ہی دیکھتی رہ گئی۔ وہ ہنس کر بولا ایک راز کی بات بتاؤں آپ کو کہ آپ کے کزن رضی صاحب عاصم کے ساتھ کچھ ساز باز کر گئے ہیں۔ میں تو جانتا ہوں۔ اور آپ اسے ذرا ڈرا دھمکا کر معلوم کیجئے کہ آپ کے خلاف کوئی سازش تیار ہوئی ہے۔



اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کرے سے باہر نکل گیا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ سروش پشیمان ہی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”سروش!!! عاصم نے پکارا۔ تو اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرایا۔ ”یہاں آئیے۔“

وہ شش و پنج کے عالم میں کھڑی رہی۔ عاصم کی طرف دیکھنا بھی قیامت ہو گیا تھا۔ وہ عجیب سی ہوری تھی۔ ”سروش کیا آپ ابھی تک ناراض ہیں۔“ عاصم نے پوچھا۔ سروش نے ہلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ قدم آگے بڑھ کر اس کے بیٹھ